

تصانیف

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب

چند تصانیف

- ۱۔ نوادر الفقہ (کامل ۲ جلد)
- ۲۔ احکام زکوٰۃ
- ۳۔ حیات مفتی اعظم
- ۴۔ درس مسلم
- ۵۔ دینی جماعتیں اور موجودہ سیاست
- ۶۔ رفیق حج
- ۷۔ علامات قیامت اور نزول مسیح
- ۸۔ علم الصیغہ مع اردو تشریحات
- ۹۔ عورت کی سربراہی کی شرعی حیثیت
- ۱۰۔ فقہ اور تصوف ایک تعارف
- ۱۱۔ فقہ میں اجماع کا مقام
- ۱۲۔ کتابت حدیث
- ۱۳۔ عہد رسالت و عہد صحابہ میں
- ۱۴۔ میرے مرشد حضرت عارفی
- ۱۵۔ یورپ کے تین معاشی نظام
- ۱۶۔ ضابطہ المنطرات فی مجال التداوی (عربی)
- ۱۷۔ شرح عقود رسم المفتی (عربی)
- ۱۸۔ مکاتبتہ الاجماع و حجیۃ (عربی)

چند اصلاحی تقریریں

- ۱۔ دوسرا جہاد افغانستان اور ہمارے فرائض
- ۲۔ اللہ کا ذکر
- ۳۔ ایٹمی دھماکہ اور خود انحصاری
- ۴۔ جنت کا آسان راستہ
- ۵۔ جہاد کشمیر اور ہماری ذمہ داری
- ۶۔ چند ثواب کے کام
- ۷۔ حب جاہ ایک باطنی بیماری
- ۸۔ خدمتِ خلق
- ۹۔ دینی مدارس اور نفاذ شریعت
- ۱۰۔ دینی تعلیم اور عصیت
- ۱۱۔ طلباء دین سے فکر انگیز خطاب
- ۱۲۔ محبت رسول ﷺ اور اس کے تقاضے
- ۱۳۔ دوقومی نظریہ
- ۱۴۔ مستحب کام اور ان کی اہمیت
- ۱۵۔ مخلوق خدا کو فائدہ پہنچاؤ

نوادر الفقہ



حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

مکتبۃ دارالعلوم
کراچی

نوادر الفقہ

فقیہ رسالۃ
اور منتخب فتاویٰ کا مجموعہ

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم
مفتی و صدر جماعت دارالعلوم کراچی

مکتبۃ دارالعلوم
کراچی

باہتمام : شرافت علی

طبع جدید : یکم صفر المظفر ۱۴۳۶ھ بمطابق ۲۵/نومبر ۲۰۱۴ء



ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی

مکتبہ معارف القرآن احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

ادارہ اسلامیات اردو بازار کراچی

دارالاشاعت اردو بازار کراچی

مکتبہ دارالعلوم کراچی
(احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی)

فون نمبر : 021-35042280

استقبالیہ : 021-35049774-6

ای میل : mdukhi@gmail.com

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۵	تاریخ زکوٰۃ	۱	☆ زکوٰۃ آرڈیننس سے پیدا
۲۷	زکوٰۃ کے معاملہ میں غفلت	۹	شدہ مسائل
۲۷	زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا عذاب	۱۱	زکوٰۃ و عشر کا سرکاری انتظام
۲۹	زکوٰۃ کس قسم کے مال پر فرض ہے؟	۱۲	سودی اکاؤنٹس اور زکوٰۃ
۳۱	شرائط زکوٰۃ	۱۳	نیت
۳۲	سونے چاندی کی زکوٰۃ	۱۴	ادائیگی زکوٰۃ
۳۵	نقد روپیہ کی زکوٰۃ	۱۴	سال گزرنے کی شرط
۳۶	مال تجارت کی زکوٰۃ	۱۶	نابالغ و مجنون کی زکوٰۃ
	مقروض پر زکوٰۃ کب فرض ہے کب	۱۶	قرضوں کی منہائی؟
۳۹	نہیں؟	۱۷	عشر
	قرض خواہ پر زکوٰۃ کب فرض ہے کب		
۳۹	نہیں؟		
۴۲	پیشگی زکوٰۃ کا حکم		
	سال مکمل ہونے کے بعد مال ختم یا کم ہو		
۴۳	جانے کا حکم		
۴۴	ادائیگی زکوٰۃ کا طریقہ		

صفحہ	مضامین	صفحہ
۴۶.....	زکوٰۃ کی نیت	۴۶
۴۸.....	کسی اور شخص کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرنا	۴۸
۸۵.....	مساجد، اسلامی مدارس انجمنوں اور جماعتوں کو زکوٰۃ دینے کے احکام	۵۳
۵۵.....	تنبیہ	۵۵
۵۶.....	رشتہ داروں اور متعلقین کو زکوٰۃ دینا	۵۶
۱۰۳.....	زکوٰۃ دینے میں غلطی ہو جائے تو اس کا حکم	۵۷
۵۸.....	متفرقات	۵۸
۵۸.....	تنبیہ	۵۸
۵۹.....	عشر اور عشری زمین کی تعریف	۵۹
۶۰.....	زکوٰۃ عشر میں فرق	۶۰
۶۱.....	کس قسم کی پیداوار پر عشر ہے اور کتنا؟	۶۱
۱۲۲.....	☆ زکوٰۃ و عشر آرڈیننس میں اصلاحات کے لئے تجاویز	۶۵
۱۲۶.....	☆ مسائل صدقہ فطر	۷۱
۱۲۶.....	☆ جہالت فی الاجرت کا مسئلہ	۷۱
۱۱۹.....	☆ جرمنی میں رویت ہلال کا مسئلہ	۷۷
۱۱۹.....	☆ اس فنڈ پر زکوٰۃ	۱۲۲
۱۲۶.....	☆ اصل فنڈ سے حاصل شدہ مزید نفع کا حکم	۱۲۶
۱۳۱.....	☆ ہاؤس بلڈنگ فنانس	۱۳۱
۱۳۱.....	☆ کارپوریشن کے لئے چند تجاویز	۱۳۱
۱۳۱.....	☆ امریکہ میں انشورنس کی ایک	۱۳۱

صفحہ	مضامین	صفحہ
۱۳۱.....	☆ جائز صورت	۱۳۱
۱۵۱.....	☆ عورت کی سربراہی کا مسئلہ	۱۵۱
۱۵۳.....	☆ آحادیث	۱۵۳
۱۵۴.....	☆ آیات قرآنیہ	۱۵۴
۱۵۷.....	☆ امامت کی دو قسمیں	۱۵۷
۱۶۰.....	☆ عورت ایک متاع پوشیدہ ہے	۱۶۰
۱۶۶.....	☆ اجماع امت	۱۶۶
۱۷۱.....	☆ عہد حاضر کے بعض محققین کی تصریحات	۱۷۱
۱۷۳.....	☆ حافظ ابن جریر طبری کا مسلک	۱۷۳
۱۷۶.....	☆ ملکہ بلقیس کا واقعہ	۱۷۶
۱۷۹.....	☆ حضرت عائشہؓ اور جنگ جمل	۱۷۹
۱۸۸.....	☆ حضرت تھانویؒ قدس سرہ کی ایک تحریر	۱۸۸
۱۸۸.....	☆ جمہوری نظام میں ریاست کے تین کام	۱۸۸
۱۹۳.....	☆ تاریخ کی بعض مثالیں	۱۹۳
۱۹۴.....	☆ تمام مکاتب فکر کے پاکستانی علماء کا فیصلہ	۱۹۴
۱۹۵.....	☆ بطور احتجاج پتلا جلانا	۱۹۵
۲۰۳.....	☆ دینی جماعتیں اور موجودہ سیاست	۲۰۳
۲۲۳.....	☆ نظام قضاء کی شرعی حیثیت	۲۲۳
۲۲۸.....	☆ خلافت راشدہ میں اور اس کے بعد	۲۲۸
۲۳۲.....	☆ دیوانی مقدمات کی خصوصی اہمیت	۲۳۲
۲۳۲.....	☆ پاکستان میں دیوانی مقدمات کی افسوسناک صورت حال	۲۳۲
۲۳۳.....	☆ پاکستان کے موجودہ ضابطہ دیوانی کی خامیاں	۲۳۳
۲۳۳.....	☆ تدوین جدید کی ضرورت	۲۳۳
۲۳۷.....	☆ مشورہ کی دینی اہمیت	۲۳۷
۲۴۰.....	☆ مشورہ کن امور میں ہونا چاہئے؟	۲۴۰
۲۴۲.....	☆ ارکان شوریٰ میں دو وصف ضروری ہیں	۲۴۲
۲۴۳.....	☆ مشورہ کی شرعی حیثیت	۲۴۳
۲۴۵.....	☆ آنحضرت ﷺ کو مشورہ لینے کا حکم کیوں دیا گیا؟	۲۴۵
۲۴۶.....	☆ اسلام کا طرز حکومت شوریٰ ہے	۲۴۶
۲۴۷.....	☆ مغربی جمہوریت	۲۴۷
۲۵۰.....	☆ مشورہ میں اختلاف رائے ہو جائے تو فیصلہ کیسے ہو؟	۲۵۰
۲۵۰.....	☆ اسلامی قانون شہادت اور	۲۵۰

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
ماہرین کی رپورٹیں.....	۲۵۵	حمل ظاہر ہو جائے لیکن کوئی گواہ نہ	
شہادت کا مسئلہ.....	۲۶۰	ہو تو کیا عورت کو سزا دی جائیگی	۲۹۵
خلاصہ بحث.....	۲۶۶	☆ زنا بالجبر حرامہ میں شامل ہے یا	
خبر کا مسئلہ.....	۲۶۸	حد میں؟.....	۳۰۱
جسمانی عیوب و امراض کے متعلق طبعی		☆ رجم کی سزا کا حکم سورہ نور کے	
رپورٹ کی عدالتی حیثیت.....	۲۷۲	نزول سے پہلے یا بعد میں؟.....	۳۰۵
شوہر کے محبوب ہونے کے متعلق بھی ایک		☆ تعزیر کی کم سے کم مقدار کیا	
شخص کی خبر کافی ہیں.....	۲۷۶	☆ اگر زنا کے گواہوں میں کوئی	
جرائم میں زہموں کے مستات لہ اجازتہ کی		ہے؟.....	۳۱۵
عدالتی حیثیت.....	۲۷۷	☆ احسان کی تعریف کیا ہے؟.....	۳۱۹
☆ اگر زنا کے گواہوں میں کوئی		☆ حدود کے مسائل میں خواتین	
گواہ کو ابھی سے انحراف کرے تو		کیا حکم ہوگا؟.....	۲۸۱
☆ کیا گواہ غیر مسلم ہو سکتا ہے؟.....	۲۸۷	☆ حدود کے مسائل میں خواتین	
☆ کیا قاضی کے لئے مسلمان		☆ شہادت.....	۳۲۳
ہونا شرط ہے؟.....	۲۹۱	☆ عدالتوں کی دی ہوئی سزاؤں کو	
☆ بدکاری کے نتیجہ میں اگر عورت کا		☆ معاف کرنے کی شرعی حیثیت	۳۲۷
☆ مسائل چرم قربانی.....	۳۳۱		

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
کھال کے احکام.....	۳۳۲	کھال کی قیمت کے احکام.....	۳۳۳
کھال کی قیمت کے احکام.....	۳۳۳	مصرف؟.....	۳۳۵
حیلہ تملیک.....	۳۳۷	متفرق مسائل.....	۳۳۷
فلمی دھوں میں نعت.....	۳۵۱	داڑھی کی مقدار کی تحقیق.....	۳۵۵
سفید بالوں کا خضاب.....	۳۶۱	لباس کے شرعی احکام.....	۳۶۵
الکحل اور اسپرٹ کے احکام.....	۳۶۹	ایک مشہور فرضی وصیت نامہ کی اصل نامہ کی	
اصل حقیقت.....	۳۷۵	خواتین کو لکھنے کی تعلیم.....	۳۸۱

زکوٰۃ و عشر آردینس سے پیدا شدہ مسائل

احکام زکوٰۃ و عشر
(زکوٰۃ کے متفرق مسائل)

زکوٰۃ و عشر آرڈی نینس سے پیدا شدہ نئے مسائل

زکوٰۃ کے ضروری مسائل پیچھے آچکے ہیں یہاں حکومت پاکستان کے نافذ کردہ ”زکوٰۃ و عشر آرڈی نینس“ سے پیدا شدہ کچھ نئے مسائل کی وضاحت کی جا رہی ہے تاکہ قارئین اپنی زکوٰۃ کے حسابات ان کی روشنی میں درست اور مکمل فرمائیں۔

زکوٰۃ و عشر کا سرکاری انتظام

جس طرح نماز قائم کرنے کے لئے مناسب کوشش اور موثر اقدامات کرنا اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے، اسی طرح شرعی ضابطے کے مطابق مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کر کے اس کے مستحقین تک پہنچانا بھی قرآن و سنت کی رو سے حکومت کی ایک اہم شرعی ذمہ داری ہے، جس پر چاروں اماموں اور اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے، اس سلسلے میں حکومت پاکستان نے جو آرڈی نینس نافذ کیا ہے اس کا مقصد بھی اسی بابرکت نظام کو قائم کرنا قرار دیا گیا۔ جب یہ آرڈی نینس پہلی بار جون ۱۹۸۰ء میں نافذ ہوا تو شرعی لحاظ سے اس میں کئی خامیاں تھیں، جن کی نشان دہی ملک کے اہل فتویٰ علماء کرام نے اسی وقت نہایت تفصیل سے کر دی تھی، جو دارالعلوم کراچی کے ترجمان ماہنامہ ”البلاغ“ کے شمارہ رمضان ۱۴۰۱ھ میں شائع بھی ہو چکی ہے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس کے بعد حکومت نے جو نیا ترمیم شدہ زکوٰۃ

و عشر آرڈی ننس ۱۹۸۰ء نافذ کیا اس میں علماء کرام کی پیش کردہ تجاویز کی روشنی میں ترامیم کر دی گئیں۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ حکومت اور مسلمانان پاکستان مل کر اس نظام کو زیادہ سے زیادہ کامیاب اور قابل اعتماد بنائیں، مقامی زکوٰۃ کمیٹیوں میں عوام اپنے میں سے جو زیادہ متقی اور پرہیزگار لوگ ہوں ان کو منتخب کریں اور جن اداروں یا افراد کی نامزدگی حکومت کرتی ہے ان میں بھی انہی صفات کو سر فہرست رکھا جائے۔

سودی اکاؤنٹس اور زکوٰۃ

بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ وصول کرنے پر بعض ذہنوں میں یہ خلجان رہتا ہے کہ یہ سودی اکاؤنٹس ہیں، اور سود اور زکوٰۃ کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی حکومت میں سودی کاروبار کا وجود اس کے ماتھے پر کلنگ کا شرمناک ٹیکہ ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ بجلت مکمل مسلمانوں کو سودی نظام کی اس لعنت سے نجات دلائے، نیز جہاں تک زکوٰۃ کی ادائیگی کا تعلق ہے، اگر کسی شخص کی آمدنی حلال و حرام سے مخلوط ہو، اور وہ مجموعے میں سے زکوٰۃ نکال دے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ حلال آمدنی کا ڈھائی فیصد، زکوٰۃ نہیں ہوگا، بلکہ وہ صدقہ سمجھا جائے گا جو حرام آمدنی سے جان چھڑانے کے لئے کرنا واجب ہے۔ اصل شرعی حکم یہ ہے کہ سود لینا قطعاً حرام ہے، لیکن اگر کوئی شخص سود وصول کر لے، تو وہ پورا کا پورا فقراء و مساکین کو دے دینا واجب ہے، اب اگر حکومت نے اس میں سے ڈھائی فیصد، زکوٰۃ فنڈ میں دے دیا ہے (جب کہ زکوٰۃ فنڈ میں دیگر صدقات و عطیات

بھی شامل ہیں) تو مالکان پر شرعاً واجب ہے کہ باقی ماندہ سود بھی یا تو وصول ہی نہ کریں، اور اگر وصول کر لیا ہے تو فقراء و مساکین کو دے دیں۔ نہ یہ کہ اس کی بنا پر اصل مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہ کریں۔

مثلاً ایک شخص کے دس ہزار روپے بینک میں جمع تھے، اور اس پر ایک ہزار روپے سود کا اضافہ ہو گیا، تو حکومت پورے گیارہ ہزار روپے پر ڈھائی فیصد کے حساب سے دو سو پچھتر روپے وصول کرے گی، ان دو سو پچھتر روپے میں سے دو سو پچاس روپے تو اس شخص کے اصل دس ہزار کی زکوٰۃ ہے، اور پچیس روپے زکوٰۃ نہیں، بلکہ سود کی جو رقم ساری کی ساری صدقہ میں دینی چاہئے تھی، اس کا ایک حصہ ہے۔ اگر یہ بھی زکوٰۃ فنڈ میں چلا جائے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، کیونکہ اس کا مصرف بھی فقراء ہی ہیں۔

نیت

مسئلہ :- زکوٰۃ ایک عبادت ہے، اور دوسری عبادتوں کی طرح اس کی ادائیگی میں بھی نیت ضروری ہے، لیکن فقہاء کرام نے صراحت فرمائی ہے کہ حکومت کو جن اموال کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہے، ان میں حکومت کا وصول کر لینا ہی بذات خود نیت کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ (ثامی ص ۳۳ ج ۲)

لہذا جن حضرات کی زکوٰۃ بنک اکاؤنٹس وغیرہ سے حکومت نے وضع کر لی ہے، اگر انہوں نے نیت نہیں کی تھی، تب بھی وہ زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ مالکان خود بھی نیت کیا کریں۔

ادائیگی زکوٰۃ

زکوٰۃ جس جس قسم کے مال پر فرض ہے۔ اس کی ضروری تفصیل پیچھے حصہ اول میں آچکی ہے۔ حکومت ان میں سے صرف ایسے اموال کی زکوٰۃ جبراً وصول کرتی ہے، جن کا ذکر آرڈی نینس کے شیڈول نمبر میں کیا گیا ہے، شرعاً ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن باقی اموال جن کی زکوٰۃ شریعت کی رو سے فرض ہے، لیکن حکومت نے وصول نہیں کی (مثلاً کرنٹ اکاؤنٹ، سونا، چاندی، نقد روپیہ، سامان تجارت اور مویشی) ان کی زکوٰۃ، مالکان خود ادا کریں۔

سال گزرنے کی شرط

مسئلہ :- زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت واجب ہوتی ہے، جب نصاب پر پورا سال گزر جائے اور ہر شخص کا سال زکوٰۃ قمری مہینے کی اس تاریخ سے شروع ہوتا ہے، جس میں وہ ”صاحب نصاب“ ہوا تھا۔

ہر شخص کے الگ الگ سال زکوٰۃ کی تحقیق و تفتیش سے بچنے کے لئے آرڈی نینس میں زکوٰۃ کی وصولیابی کی ایک ہی تاریخ یکم رمضان المبارک سب کے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔ انتظامی مجبوری سے ایسا کرنے میں شرعاً مضائقہ نہیں، نئے ترمیم شدہ آرڈی نینس میں ایسے حضرات کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جو یکم رمضان سے کچھ ہی عرصہ پہلے صاحب نصاب ہوئے ہوں، پورا سال ان کے نصاب پر نہ گزرا ہو۔ لیکن شرعاً صاحب نصاب کا سال زکوٰۃ بہر حال اسی تاریخ سے شروع ہوگا جس میں وہ صاحب نصاب ہوا تھا۔ لہذا ہر شخص کو اپنی یہ تاریخ یاد رکھنی چاہئے، اگر یقین سے یاد نہ ہو تو جس تاریخ کے متعلق گمان غالب

ہو، شرعاً اسی تاریخ سے سال زکوٰۃ شروع سمجھا جائے گا۔ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کا حساب اسی تاریخ سے کرے۔

مسئلہ :- جب کوئی شخص نصاب کا مالک ہو جائے اور سال کے ختم پر بھی صاحب نصاب ہو، تو سال کے ختم پر بھی جتنا بھی روپیہ، سونا، چاندی، یا مال تجارت اس کی ملکیت میں ہوگا، اس سارے مال پر شرعاً زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، خواہ اس مال کا کچھ حصہ ایک ہی دن پہلے اس کی ملکیت میں آیا ہو۔

خلاصہ یہ کہ ہر رقم اور ہر مال پر الگ الگ سال گزرتا ضروری نہیں، سال کے اول و آخر میں بقدر نصاب ہونا ضروری ہے اگر سال پورا ہونے سے پہلے اس کا سارا مال خرچ ہو گیا، یا مقدار نصاب سے کم رہ گیا، تو زکوٰۃ فرض نہیں رہی۔

مسئلہ :- کسی صاحب نصاب کی زکوٰۃ اس کا سال زکوٰۃ پورا ہونے سے پہلے حکومت نے وصول کر لی تو وہ ادا ہو گئی، کیونکہ صاحب نصاب کسی سال کی زکوٰۃ پیشگی دید سے تو یہ بھی جائز ہے۔ البتہ اگر اس شخص کا سال پورا ہونے تک مال بڑھ گیا تو اس بڑھے ہوئے مال کی زکوٰۃ علیحدہ دینی ہوگی۔ (در مختار و ثانی)۔

اور اگر مال گھٹ گیا تو گھٹے ہوئے مال کی زکوٰۃ جو حکومت وصول کر چکی ہے وہ اس شخص کی طرف سے نفلی صدقہ بن جائے گی، لیکن اگر کوئی شخص یہ رقم نفلی صدقے کے طور پر بھی سرکاری زکوٰۃ فنڈ میں جمع کروانے پر راضی نہیں، تو اسے یہ رقم واپس لے لینا بھی شرعاً جائز ہے، جس کی گنجائش ترمیم شدہ آرڈی نینس میں بھی رکھی گئی ہے۔

نابالغ اور مجنون کی زکوٰۃ

مسئلہ :- امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے صاحب نصاب کا عاقل و بالغ ہونا شرط ہے، جب کہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک نابالغ اور مجنون کے مال پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

آرڈی نینس میں بالغ و نابالغ، اور عاقل و مجنون کی اکاؤنٹس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ غالباً اس میں شافعی اور مالکی مسلک اختیار کیا گیا ہے، اور لوگوں کے موجودہ حالات کے پیش نظر اگر ضرورت داعی ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

لیکن جن اموال کی زکوٰۃ حکومت جبراً وصول نہیں کرتی، لوگ خود ادا کرتے ہیں۔ حنفی حضرات ان کی زکوٰۃ، نابالغ اور مجنون کی مال میں سے ادا نہ کریں۔

قرضوں کی منہائی؟

مسئلہ :- اگر کوئی صاحب نصاب مقروض ہو تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ قرض قابل زکوٰۃ مالیت میں سے منہا کیا جائے گا، منہائی کے بعد اگر وہ شخص صاحب نصاب ہی نہ رہا تو زکوٰۃ واجب نہیں ورنہ صرف باقی مال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

فقہ حنفی کا اصل ضابطہ تو یہی ہے، چنانچہ ترمیم شدہ آرڈینس میں بعض شرائط کے ساتھ بعض خاص قسم کے قرضوں کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس زمانے میں بڑے بڑے مالداروں کا کاروبار ہی یہ ہو گیا ہے کہ قابل زکوٰۃ مال جتنا بڑھتا جاتا ہے، اس سے زیادہ قرض لیتے جاتے ہیں، اور نئی نئی ملیں کارخانے کھولتے جاتے ہیں۔ اگر ان سب قرضوں کو منہا کیا جائے تو ایسے

مالداروں کو شاید زکوٰۃ دینے کی توفیق ہی نہ ہو، جو مقاصد شریعت کے بالکل خلاف ہے۔

لہذا اس زمانے کے متعدد علماء اہل فتویٰ، خصوصاً والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا فتویٰ یہ تھا کہ ایسے کاروباری حضرات کے لئے اپنے آپ کو زکوٰۃ سے فارغ سمجھنا مناسب نہیں۔ اور جس قدر اپنا مال قابل زکوٰۃ ہے۔ اس کی زکوٰۃ دینی چاہئے بالخصوص جب کہ امام شافعی کے نزدیک کسی بھی قسم کے قرض کو زکوٰۃ سے منہا کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانے میں پیداواری مقاصد کے لئے حاصل کئے ہوئے قرضے زکوٰۃ سے منہا نہیں کرنے چاہئیں ہاں کسی نے اپنی ضروریات زندگی کے لئے قرض لیا ہو تو اسے زکوٰۃ سے منہا کیا جائے گا۔

عشر (۱)

مسئلہ :- عشری زمین، کھیت، اور باغات کی پیداوار پر عشر واجب ہوتا ہے، زمین بارش سے سیراب ہوتی ہو تو پیداوار کا دس فیصد حصہ، اور نہریا کنویں سے سیراب کی جاتی ہو تو پانچ فیصد حصہ ادا کرنا واجب ہے۔

زمیندار پر اپنے حصہ پیداوار کا عشر دینا واجب ہے۔ اور کاشتکار (مزارع) پر اپنے حصہ پیداوار کا، آرڈینس کی رو سے حکومت صرف زمیندار کے حصے کا عشر وصول کرے گی۔

کاشتکار سے جبراً وصول نہیں کیا جائے گا۔ شرعاً کاشتکاروں پر لازم ہے کہ وہ

اپنے حصہ پیداوار کا عشر خود ادا کریں۔

نیز آرڈی منس کی رو سے حکومت بارانی زمینوں کی پیداوار سے بھی صرف پانچ فیصد جبراً وصول کرے گی جبکہ شرعاً دس فیصد واجب ہے لہذا زمینداروں اور کاشتکاروں پر لازم ہے کہ باقی پانچ فیصد وہ خود ادا کریں۔

مسئلہ :- آرڈی منس میں پیداوار کے چوتھائی حصے کو اخراجات کی مد میں عشر سے مستثنیٰ کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے بعض فقہاء کرام کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء کے مسلک میں یہ چھوٹ نہیں ہے۔ لہذا حنفی حضرات پر لازم ہے کہ اس چوتھائی حصہ پیداوار کا عشر وہ خود ادا کریں۔ واللہ اعلم



﴿ اَقِمْوَا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ﴾

احکام زکوٰۃ و عشر

بتصدیق

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب^{رحمۃ اللہ علیہ}

تاریخ تالیف : ۲ شعبان ۱۳۸۲ھ

مقام تالیف : جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

تصدیق و تقریظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احقر نے رسالہ احکام زکوٰۃ مؤلفہ بر خوردار عزیز مولوی محمد رفیع سلمہ جو میری ہی فرمائش پر لکھا گیا ہے پورا دیکھا ماشاء اللہ مسائل سب صحیح مستند کتابوں کے حوالہ سے سلیس عام فہم زبان میں جمع کر دیے گئے ہیں اس میں زکوٰۃ کے ضروری احکام و مسائل پوری تفصیل سے آگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور مؤلف کے علم، عمل اور عمر میں ترقیات عطا فرمائیں۔ آمین

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲۱ شعبان ۱۳۸۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وكفى و سلام على عباده الذين اصطفى

زکوٰۃ کے احکام و مسائل کی ضرورت و اہمیت محتاج بیان نہیں خصوصاً اس زمانہ میں کہ دین اور علم دین سے ناواقفیت اور اس کے ساتھ بے پروائی طوفان کی طرح بڑھ رہی ہے۔ بعض حضرات نے والد محترم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ سے درخواست کی کہ سہل اردو زبان میں احکام زکوٰۃ لکھ کر شائع کئے جائیں۔ ممدوح کو ہجوم مشاغل کی وجہ سے فرصت نہ تھی اس لئے ناکارہ کو اس کام کے لئے مامور کر دیا۔ اپنی علمی بے مائیگی کے ساتھ دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمت اور سالانہ امتحان کا زمانہ تھا۔ مگر تعمیل ارشاد کو سرمایہ سعادت سمجھ کر جو کچھ ہو سکا لکھ کر پیش کر دیا۔ اور موصوف کی نظر و اصلاح کے بعد اب اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ مسائل لکھنے میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ زبان زیادہ سے زیادہ سہل اور عام فہم ہو۔ اور اس کے لئے جگہ جگہ الفاظ کی خوبصورتی کو بھی چھوڑ دینا پڑا۔ مقصد یہ ہے کہ کم لکھے پڑے اشخاص بھی یہ مسائل بہ آسانی سمجھ سکیں۔

﴿ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم﴾

بندہ محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

مدرس دارالعلوم کراچی

اصطلاحات و تعریفات

قرآن وحدیث میں زکوٰۃ و صدقات کے متعلق چند الفاظ بار بار آئے ہیں۔ زکوٰۃ۔ صدقہ۔ انفاق فی سبیل اللہ۔ اطعام۔ اسی طرح کتب فقہ میں زکوٰۃ۔ خسر۔ خمس۔ نصاب وغیرہ کے اصطلاحی الفاظ بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ شروع میں ان کی تعریف اور معنی لکھے جاتے ہیں تاکہ متعلقہ مسائل کے سمجھنے میں سہولت ہو۔

زکوٰۃ: اس کے لغوی معنی بڑھنے اور پاک ہونے کے ہیں۔ مگر بقول امام راغب اصفہانی ہر بڑھوتری کو زکوٰۃ نہیں کہا جاتا۔ بلکہ ایسی معنوی زیادتی کو زکوٰۃ کہتے ہیں جو منجانب اللہ بطور برکت کے ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر طہارت اور پاکی کو زکوٰۃ نہیں کہتے ہیں بلکہ اس باطنی اور معنوی پاکی کو کہتے ہیں جو منجانب اللہ کسی کو حاصل ہو۔ انسان اختیاری طور پر اپنے بدن یا کپڑے وغیرہ کو پاک کرے وہ زکوٰۃ نہیں کہلاتی۔ قرآن وسنت کی اصطلاح میں زکوٰۃ اس حصہ مال کو کہا جاتا ہے جو فی سبیل اللہ بطور فریضہ مالیہ کے نکالا جائے۔ اسکو زکوٰۃ کہنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ حسب تصریح قرآن وحدیث زکوٰۃ نکالنا مال میں برکت و زیادتی کا سبب ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ زکوٰۃ نکالنے سے انسان کو باطنی پاکی حاصل ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن وسنت کی اصطلاح میں زکوٰۃ اس حصہ مال کو کہا جاتا ہے جس کا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا انسان پر فرض کیا گیا ہے۔ کتب فقہ میں بھی زکوٰۃ اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے۔

صدقہ: یہ لفظ صدق سے ماخوذ ہے جس کے معنی سچ اور سچائی کے

ہیں۔ صدقہ اس مال کو کہا جاتا ہے جو سچے دل سے خالص رضا الہی کے لئے خرچ کیا جائے، یہ لفظ قرآن و سنت کی اصطلاح میں عام ہے، صدقہ واجبہ، زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر کو بھی صدقہ کہا جاتا ہے۔ اور نفلی طور پر بغرض ثواب کچھ مزید خرچ کیا جائے اس کو بھی صدقہ کہتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں فرض نفل دونوں قسم کے لئے لفظ صدقہ کا استعمال بکثرت معروف ہے۔ کتب فقہ میں بھی اسی طرح یہ لفظ عام معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بلکہ حدیث میں تو اس کا استعمال اس سے بھی زیادہ عام معنی میں ہر نیک کام کے لئے کیا گیا ہے۔ کسی سے ہنس کر بولنے کو کسی کا بوجھ اٹھوا دینے وغیرہ کو بھی حدیث میں صدقہ فرمایا ہے۔

خیرات: یہ لفظ جس معنی کے لئے اردو میں بولا جاتا ہے قرآن و حدیث میں اس معنی کے لئے اس کا استعمال نہیں ہوا۔ ہمارے محاورے میں لفظ خیرات بھی صدقات ہی کے معنی میں بولا جاتا ہے جو فرض و نفل ہر قسم کے صدقات کیلئے حاوی ہے۔

انفاق و اطعام: انفاق کے لفظی معنی خرچ کرنے کے اور اطعام کے معنی کھانا کھلانے کے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صدقہ کی طرح عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فرض و واجب کیلئے بھی اور نفل و تبرع کیلئے بھی۔

عشر: فقہ میں زرعی زمینوں کی پیداوار پر جو شرعی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس کو عشر کہتے ہیں۔ اسی طرح تجارتی اموال کی زکوٰۃ جو راستوں پر چوکیاں بٹھا کر وصول کی جاتی ہے اس کو بھی عشر کہا جاتا ہے۔ اس کو زکوٰۃ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

خمس: وہ پانچواں حصہ مال کا ہے جو مالی غنیمت میں سے بیت المال کے لئے نکالا جائے یا مجادل یعنی مختلف قسم کی کانوں سے نکلنے والی اشیاء کا پانچواں حصہ بطور حق فقراء بیت المال میں جمع کیا جائے۔

نصاب: اصطلاح فقہ میں اس مقدار مال کو کہا جاتا ہے جس کے مالک کو عرف شرع میں مال دار سمجھا جاتا ہے جیسے ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا وغیرہ۔

زکوٰۃ کی فرضیت و اہمیت

اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن زکوٰۃ بھی ہے۔ قرآن کریم میں جاہز زکوٰۃ کو صلوٰۃ کے ساتھ لگایا ہے۔

﴿اقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ، وَاقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾

وغیرہ سارے قرآن میں پھیلے ہوئے الفاظ ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فرائض میں سب سے مقدم نماز اور اس کے بعد زکوٰۃ ہے۔

بقرح قرآن و سنت و اجماع امت جس شخص میں شرائط زکوٰۃ پائی جائیں زکوٰۃ اس پر فرض ہے جو اس کے فرض ہونے کا انکار کرے وہ مسلمان نہیں اور جو فرض ہونا تسلیم کرنے کے باوجود زکوٰۃ ادا نہ کرے وہ سخت گناہگار فاسق ہے۔

تاریخ زکوٰۃ

از روئے قرآن و سنت صحیح یہ ہے کہ زکوٰۃ کا فریضہ مسلمانوں پر مکہ مکرمہ

میں ہی نماز کے ساتھ عائد ہو چکا تھا جیسا کہ سورتوں میں زکوٰۃ کے احکام سے ثابت ہوتا ہے اور امام تفسیر ابن کثیر وغیرہ نے اسکی تصریح فرمائی ہے۔

البتہ نصاب زکوٰۃ اور مقدار زکوٰۃ اور مصارف زکوٰۃ کے تعینات اور ان کی وصولیابی کا سرکاری انتظام مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد تدریجاً ہوا ہے۔ ۲ھ میں صدقہ الفطر واجب کیا گیا۔ اور اس کے بعد سرکاری طور پر زکوٰۃ و عشر وغیرہ وصول کرنے کے لئے مدینہ کی اسلامی حکومت کی طرف سے عمال مقرر ہوئے اور اس طرح کے تمام اموال صدقہ بیت المال میں جمع کر کے فقراء و مساکین پر صرف کرنے کا اہتمام ہوا۔

زکوٰۃ نماز کی طرح ایک مالی عبادت ہے جس کا ادا کرنا ہر مال دار کے ذمہ ہر حال میں ضروری ہے۔ کوئی اسلامی حکومت اور اسلامی بیت المال اس کو وصول کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ پچھلے انبیاء کی تمام شریعتوں میں بھی نماز کی طرح زکوٰۃ کی پابندی فرض تھی۔ مگر ان کی شریعتوں میں مال زکوٰۃ کو فقراء اور مساکین کی ضرورتوں میں خرچ کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ اس کو کسی جگہ میں رکھ دیا جاتا تھا جس کو آسمانی بجلی آکر جلا دیتی تھی یہی قبولیت زکوٰۃ کی علامت تھی۔

امت مرحومہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اسکی اجازت دیدی کہ اس مال کو مسلمانوں کے فقراء و مساکین پر خرچ کیا جائے۔ امت کے فقراء و مساکین کی مشکلات حل کرنے کا یہ ایک ایسا بہترین طریقہ ہے کہ اگر زکوٰۃ کو صحیح طور نکالا جائے اور اس کے صحیح مصرف پر خرچ کرنے کا اہتمام کیا جائے تو بقول بعض اہل یورپ کے ایک مسلمان بھی ننگا بھوکا نہیں رہ سکتا۔

زکوٰۃ کے معاملہ میں غفلت

مگر افسوس یہ ہے کہ آج کل عام جہالت و غفلت کی بناء پر بہت سے مسلمان زکوٰۃ نکالتے ہی نہیں اور جو زکوٰۃ نکالتے ہیں وہ زکوٰۃ کا نکالنا کافی سمجھتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے صرف زکوٰۃ اپنی جیب سے نکالنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اسکو مستحقین تک پہنچانے اور ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔

قرآنی ارشاد اتوا الزکوٰۃ کے معنی نکالنے کے نہیں بلکہ ادا کرنے کے ہیں اور ادا کرنا اسی کو کہا جاتا ہے کہ جس کا حق ہے اس کو پہنچایا جائے محض اپنے پاس سے نکال دینے اور کسی کو دے دینے سے حق ادا نہیں ہوتا جیسا کہ دنیوی قرضوں میں ہر شخص جانتا ہے کہ جو قرض کسی کا کسی کے ذمہ ہے وہ محض جیب سے ادا کرنے پر ادا نہیں ہو جاتا جب تک قرض خواہ تک پہنچا کر اس کا مالکانہ قبضہ نہ کرادیا، قرض سے سبکدوشی نہیں ہوتی، اسی طرح جب تک زکوٰۃ مستحقین تک نہ پہنچائی جائے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس میں عام طور پر زکوٰۃ نکالنے والے مسلمان بڑی غفلت کے شکار ہیں، کہ مستحقین کی تلاش و تحقیق کئے بغیر رقم کسی کو دے کر اپنے آپ کو سبکدوش سمجھ لیتے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ غیر مستحق لوگ زکوٰۃ پر قابض ہو جاتے ہیں اور مستحقین افلاس و مصیبت کا شکار رہتے ہیں۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا عذاب

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ☆ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فُتْكُوىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۚ هَٰذَا مَا كُنَزْتُمْ لَأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿سورہ توبہ پ ۱۰﴾

ترجمہ: جو لوگ سونا چاندی جمع کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی زکوٰۃ نہیں نکالتے) سو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے جو کہ اس روز واقع ہوگی جبکہ اس سونے چاندی کو دوزخ کی آگ میں پہلے تپایا جائے گا پھر اس سونے چاندی سے ان لوگوں کی پیشانیوں ان کی کروٹوں، اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا (اور یہ جتلیا جائے گا) کہ یہ وہی ہے جسکو تم نے اپنے واسطے جمع کر رکھا تھا، بس اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔

۲: رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

مَامْنَعُ قَوْمَ الزَّكَاةِ إِلَّا ابْلَاهُمُ اللَّهُ بِالسَّنِينِ

(جمع الفوائد ج ۱ ص ۱۴۳)

جو قوم زکوٰۃ نہیں نکالتی اللہ تعالیٰ اسے قحط سالی یعنی ضروریات زندگی کی گرائی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

۳: آنحضرت ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے۔

مَنْ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَلَمْ يُوَدِّ زَكَوَّتَهُ مِثْلَ لَهُ مَالِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَجَاعًا أَوْ قَرَعَ لَهُ زَيْبَانٌ يَطْلُوقُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ثُمَّ يَأْخُذُ بِلَهْرَمِيهِ يَعْنِي بِشَدَقِيهِ ثُمَّ يَقُولُ أَنَا مَالِكٌ أَنَا كَنْزُكَ .

(بخاری شریف ج ۱ ص ۱۸۸)

جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی تو قیامت کے دن اس کے مال کو بزاز ہریلا گنجا سانپ بنا دیا جائے گا وہ سانپ اس کی گردن میں لپٹ جائے گا پھر اس کے دونوں جبرے نو سپے گا اور کہے گا، میں ہی تیرا مال ہوں، میں ہی تیرا خزانہ ہوں۔

۴: آپ کا ایک اور ارشاد ہے کہ ہر صبح کو دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں ایک یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ سخی کو اس کے مال کا بدلہ عطا فرما دوسرا دعا کرتا ہے کہ اے اللہ بخیل کو ہلاکت نصیب کر (بخاری مسلم)

۵: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے دو عورتوں کے ہاتھ میں سونے کے کنگن دیکھے تو ان سے پوچھا کہ ”ان کی زکوٰۃ دیتی ہو کہ نہیں، انہوں نے عرض کیا کہ نہیں“ تب آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو یہ پسند ہے کہ اس بدلے میں تم کو آگ کے کنگن پہنائے جائیں، انہوں نے عرض کیا ”نہیں“ آپ نے فرمایا تو ان کی زکوٰۃ دیا کرو۔ (ترمذی)

۶: قیامت کے دن جو سات آدمی اللہ کے سائے میں ہوں گے ان میں سے نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو بھی بیان فرمایا ہے جو ایسا چھپا کر صدقہ دے کہ اس کے دوسرے ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔ (بخاری)

زکوٰۃ کس قسم کے مال پر فرض ہے

پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر مالی فرض بہت کم سے کم ڈالا ہے اول تو ہر مال پر زکوٰۃ نہیں بلکہ صرف اس مال پر ہے جو عادتاً بڑھتا رہتا ہے جیسے مال تجارت یا مویشی یا سونا چاندی کیونکہ سونے چاندی کو اسلام نے ذریعہ

تجارت ہی قرار دیا ہے خواہ کوئی اس کو زیور بنا کر رکھے یا سونے چاندی کے ٹکڑے بند کر کے رکھے مگر شرعاً وہ مال تجارت ہی ہے اس لئے سونے چاندی پر خواہ وہ کسی صورت میں ہو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

اموال کی ان تین قسموں کے علاوہ مکان، دکان، برتن، فرنیچر اور دوسرے گھریلو سامان، ملوں اور کارخانوں کی مشینری، جواہرات خواہ کتنی قیمت کے ہوں ان پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ ہاں ان میں سے کوئی چیز فروخت کرنے کے قصد سے خریدی ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔

دوسری بات یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مال کی مذکورہ تین قسموں میں بھی مال کا مالک ہوتے ہی زکوٰۃ فرض نہیں ہو جاتی بلکہ سال بھر تک اس میں جتنا جی چاہے جہاں چاہے خرچ کرتا رہے آخر سال میں کھانے پینے، برتنے اور تمام اخراجات ضروری یا غیر ضروری سے جتنا مال بچ رہے اس پر صرف چالیسواں حصہ مال کا بطور زکوٰۃ فرض ہوتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زکوٰۃ انکم ٹیکس کی طرح آمدنی پر نہیں بلکہ اصل سرمایہ پر ہے، لیکن سرمایہ میں سے خرچ پر انکم ٹیکس کے قواعد کی طرح کوئی پابندی نہیں، اگر کوئی شخص سارا مال سال بھر میں خرچ کر ڈالے تو اس پر کوئی زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔

ایک چوتھی قسم مال کی زرعی زمین اور باغات کی پیداوار بھی ہے مگر اس کو فقہاء کی اصطلاح میں عشر کہا جاتا ہے۔ اس لئے اس کو احکام زکوٰۃ کے بعد عشر ہی کے عنوان سے لکھا جائے گا۔ اور اموال زکوٰۃ کی مذکورہ تین قسموں میں سے چونکہ مویشی کی زکوٰۃ کے معاملات خاص خاص لوگوں کو پیش آتے ہیں اس لئے اس

مختصر رسالہ میں اس کی تفصیل دینے کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ اس میں صرف مال تجارت اور سونے چاندی اور روپیہ کے احکام اور پھر عشر اراضی کے احکام بیان ہوں گے۔ یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جن اموال پر شریعت اسلام نے زکوٰۃ عائد کی ہے ان میں بھی مطلقاً ہر شخص پر ہر حال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں جہاں ان شرائط میں سے کوئی شرط معدوم ہوگی وہاں زکوٰۃ فرض نہ رہے گی۔

شرائط زکوٰۃ

- (۱) زکوٰۃ دہندہ کا مسلمان ہونا۔ کافر پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ (کافی عامۃ التون)
- (۲) بالغ ہونا۔ نابالغ بچوں کی ملکیت میں کتنا ہی مال ہو ان پر یا ان کے اولیاء (سرپرستوں) پر اس کی زکوٰۃ نہیں۔ (ہدایہ)
- (۳) عاقل ہونا۔ مجنون کے مال پر زکوٰۃ نہیں۔ جب کہ اس کا جنون سال بھر رہے۔ (در مختار و ثامی)
- (۴) آزاد ہونا۔ چنانچہ زر خرید غلام پر زکوٰۃ نہیں۔ (کافی عامۃ التون)
- (۵) مال کا بقدر نصاب ہونا۔ نصاب سے کم مال پر زکوٰۃ نہیں، نصاب کی تفصیل آگے آتی ہے۔ (در مختار ج ۲)
- (۶) اس مال کا ضرورت اصلیہ سے زائد ہونا۔ اس لئے جو چیزیں انسان کی ضروریات زندگی میں داخل ہیں جیسے رہنے کا مکان، پہننے کے کپڑے، برتنے کے برتن، یا فرنیچر یا سواری کی موٹر گاڑی وغیرہ ان پر زکوٰۃ نہیں۔ (کافی عامۃ التون)

(۸) اس مال پر پورا ایک سال گزر جانا۔ سال بھر گزرنے سے پہلے کسی مال پر زکوٰۃ نہیں۔ (ہدایہ)

(۹) مال کا نامی یعنی بڑھنے والا ہونا۔ جیسے تجارتی مال یا سونا چاندی یا مویشی وغیرہ اور جو مال نامی نہیں ہے اگرچہ ضرورت سے زائد بھی ہو اس پر زکوٰۃ نہیں جیسے ایک سے زائد مکان یا موٹر گاڑی یا غیر ضروری برتن اور فرنیچر وغیرہ۔

یہ تمام شرائط تفصیل کے ساتھ بدائع الصنائع اور فقہ کی عام کتب میں مذکور ہیں اب ہر قسم کے مال کی زکوٰۃ کے احکام علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔

سونے چاندی کی زکوٰۃ

۱: سونے کا نصاب زکوٰۃ ساڑھے سات تولہ ہے۔ اور چاندی کا ساڑھے باون تولہ۔ چنانچہ (۱) اگر کسی کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی، یا ساڑھے سات تولہ سونا ہو اور ایک سال تک باقی رہے تو سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ دینا فرض ہے اور اگر اس سے کم ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ اور اگر اس سے زائد ہو تب بھی زکوٰۃ فرض ہے۔ (ہدایہ)

۲: چاندی یا سونے کے زیور، برتن اور سچا گوٹھ ٹھپہ سب پر زکوٰۃ فرض ہے چاہے یہ زیور وغیرہ استعمال میں رہتے ہوں یا بیکار رکھے ہوں۔ غرض یہ کہ سونے یا چاندی کی ہر چیز پر زکوٰۃ فرض ہے البتہ اگر مقدار نصاب سے کم ہو تو زکوٰۃ

(۱) سونے اور چاندی کے مذکورہ وزن کی علمی تحقیق مطلوب ہو تو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی بے نظیر تصنیف ”اوزان شرعیہ“ ملاحظہ فرمائیں۔

نہیں۔ (ہدایہ)

۳: سونا چاندی اگر خالص نہ ہو بلکہ اس میں کچھ کھوٹ ملا ہو تو غالب جزو کا اعتبار ہو گا۔ سونا چاندی غالب ہو تو وہ سونا چاندی سمجھا جائے گا اور نہ زکوٰۃ فرض ہوگی، اور اگر کھوٹ زیادہ ہو، مثلاً ایک تولہ میں تین ماشہ سونا یا چاندی ہو اور نو ۹ ماشہ کھوٹ ہو، تو وہ سونا یا چاندی نہیں سمجھا جائے گا، اس پر زکوٰۃ مجزئ اس صورت کے فرض نہ ہوگی کہ یہ ”مال تجارت“ کے طور پر رکھا ہو (۱)۔ گلسٹ کے سکے روپیہ اور ریزگاری پر اسلئے زکوٰۃ ہے کہ وہ لیکن دین ہی کے لئے ہوتے ہیں۔

۴: کسی کے پاس نہ تو پوری مقدار سونے کی ہے اور نہ پوری مقدار چاندی کی، بلکہ کچھ سونا اور کچھ چاندی ہے تو اگر دونوں کی مقدار ملا کر ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ فرض ہے۔ اور اگر دونوں چیزیں اتنی کم ہیں کہ دونوں کی قیمت ملا کر بھی مقدار نصاب کی برابر نہیں ہوتی تو زکوٰۃ فرض نہیں۔ اور اگر سونے چاندی دونوں کی مقدار پوری پوری ہے تو قیمت لگانے کی ضرورت نہیں بلکہ چاندی کی زکوٰۃ اس کا حساب کر کے الگ دیں اور سونے کا زکوٰۃ اس کا حساب کر کے الگ دیں۔ (ہدایہ و عامۃ التولن)

(۵) کسی کے پاس سو (۱۰۰) تولہ چاندی رکھی تھی پھر سال گزرنے سے پہلے دو چار تولہ یا نو دس تولہ سونا بھی مل گیا تو اس کا حساب علیحدہ نہیں کیا جائے گا بلکہ اس چاندی کے ساتھ ہی ملا کر اس کا بھی حساب ہوگا، چنانچہ جنب اس چاندی کا سال پورا ہوگا، تو یہ سمجھا جائے گا کہ بعد میں ملے ہوئے سونے کا بھی سال پورا ہو گیا، چنانچہ اس پورے سونے اور چاندی کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ (ہدایہ)

(۶) کسی کے پاس سو (۱۰۰) تولہ چاندی رکھی تھی، پھر سال پورا ہونے سے پہلے دو چار تولہ یا پچاس ساٹھ تولہ چاندی اور مل گئی تو یہاں بھی یہی سمجھا جائے گا کہ اس پوری چاندی پر سال گزر گیا، چنانچہ اس پوری چاندی کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ بعد میں ملنے والی چاندی کا سال علیحدہ شمار نہیں کیا جائے گا۔ (بدایہ جلال)

خلاصہ یہ ہے کہ درمیان سال میں مال کے گھٹنے یا بڑھنے کا زکوٰۃ پر کوئی اثر نہ پڑے گا، سال کے ختم پر جتنا مال موجود ہو گا اس پورے مال پر زکوٰۃ آئیگی۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس سال بھر تک صرف ایک ہزار روپیہ تھا یا اس کی قیمت کا سونا چاندی مگر سال پورا ہونے سے چند دن پہلے اس کو نو ہزار روپیہ یا اس قیمت کا سونا چاندی مل گیا تو زکوٰۃ پورے دس ہزار کی ادا کرنا ہوگی۔

۷۔ پہننے کے کپڑے خواہ کتنے ہی زیادہ اور قیمتی ہوں ان پر زکوٰۃ فرض نہیں لیکن اگر ان پر سچا کام ہے تو اس کام میں سے جتنی چاندی نکل سکتی ہے اس کا اندازہ کر کے مال زکوٰۃ میں شامل کرنا اور اس کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہوگا۔

مثلاً ایک شخص کے پاس سو تولہ چاندی ہے اور دس تولہ سچے کام میں لگی ہوئی چاندی ہے تو ایک سو دس تولہ چاندی کی زکوٰۃ فرض ہوگی، یادو تولہ سونا ہے اور دس تولہ چاندی کا کام، تو دو تولہ سونے کی قیمت سے جتنی چاندی خریدی جاسکتی ہے۔ مثلاً آج کل کے نرخ کے اعتبار سے اس کی ایک سو چالیس تولہ چاندی آئے تو اس میں یہ دس تولہ چاندی کے کام شامل کر کے ڈیڑھ سو تولہ چاندی کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ (در مختار و ثامی)

نقد روپیہ کی زکوٰۃ

نقد روپیہ چاہے چاندی کا ہو یا گلت وغیرہ کا اس پر باتفاق فقہاء زکوٰۃ فرض ہے۔ کیونکہ یہ ثمن عرفی ہے اور لین دین ہی کے لئے اس کی وضع ہے۔ (ثامی)

۱۔ اگر کسی کے پاس ساڑھے بادل تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونے کی قیمت کے برابر نقد روپیہ موجود ہو (چاہے سونا چاندی بالکل نہ ہو) تو اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔ کیونکہ نقد روپیہ بھی سونے چاندی کے حکم میں ہے۔ (ثامی)

۲۔ مثلاً چاندی سوا دو (۱) روپیے تولہ ہے، تو اگر کسی کے پاس ایک سو اٹھارہ روپیے بارہ سٹے پیسے ہوں تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے کیونکہ یہ ساڑھے بادل تولہ چاندی کی قیمت کی برابر ہے۔

۳۔ کسی کے پاس کچھ نقد روپیہ کچھ سونا اور کچھ چاندی ہے۔ لیکن علیحدہ علیحدہ ان میں سے کوئی بھی مقدار نصاب کو نہیں پہنچتا تو سونے اور چاندی کی قیمت دیکھی جائے اگر اس سونے اور چاندی کی قیمت اور وہ نقد روپیہ ملا کر ایک سو اٹھارہ روپیے اور بارہ سٹے پیسے ہو جائیں تو زکوٰۃ فرض ہے ورنہ نہیں۔ (در مختار)

۴۔ مثلاً کسی زمانہ میں سونا ایک سو تیس روپیے تولہ اور چاندی سوا دو روپیے تولہ ہو تو اگر کسی کے پاس سال ختم پر ایک تولہ سونا اور پانچ روپیے نقد ہوں تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ کیونکہ ایک تولہ سونا ایک سو تیس روپیے کا ہوا، اور وہ پانچ (۱) آج کل چاندی کی قیمت دو روپیے ۳ آئے کا تولہ ہے اور اس میں کسی بیشی مختلف اوقات میں ہوتی رہتی ہے۔ زکوٰۃ نکالنے وقت چاندی کا بھاؤ معلوم کر کے حساب کر لینا چاہئے۔ ۱۲

منہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء۔

روپے ملا کر ایک سو پینتیس روپے ہو گئے اور یہ رقم ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے بہت زائد ہے کیونکہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تو سوادو روپے تولہ کے حساب سے صرف ایک سو اٹھارہ روپے بارہ پیسے ہوتی ہے۔ (در مختار)

۵۔ البتہ اگر صرف ایک تولہ سونا ہو اور اس کے ساتھ روپے یا چاندی بالکل نہ ہو تو زکوٰۃ فرض نہیں (جیسا کہ عام کتب فقہ میں مذکور ہے)

۶۔ کسی کے پاس تین سو روپے رکھے تھے، پھر سال پورا ہونے سے پہلے دو سو روپے اور مل گئے تو ان دو سو روپے کا حساب علیحدہ نہیں کیا جائے گا بلکہ جب ان تین سو روپے کا سال پورا ہو گا تو پورے پانچ سو روپے کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اور یہ سمجھا جائے گا کہ پورے پانچ سو روپے پر سال گزر گیا۔ (ہدایہ)

مال تجارت کی زکوٰۃ

مال تجارت وہ مال ہے جو فروخت کرنے کی نیت سے لیا ہو اس کا نصاب بھی وہی ہے جو نقد روپے کا نصاب ہے۔ یعنی کل مال کی قیمت اگر ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونے کی برابر یا اس سے زائد ہو جائے تو سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ دینا فرض ہے۔ (در مختار و شامی)

۱۔ سونا چاندی اور نقد روپے کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں مثلاً سچے موتیوں کا ہار، لوہا تانبا، پیتل، رانگ۔ گلت وغیرہ یا ان چیزوں کے بنے ہوئے برتن وغیرہ، یا کپڑے جوتے، فرنیچر، یا کوئی اور سامان، اس کا حکم یہ ہے کہ یہ مال اگر تجارت کے واسطے لیا ہے تو مقدار نصاب ہونے اور سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ نکالنا فرض

ہوگا۔ اور اگر تجارت کے لئے نہیں لیا تو زکوٰۃ فرض نہیں خواہ وہ کتنا ہی بیش قیمت اور کتنا ہی زیادہ ہو۔ اور بے ضرورت رکھا ہو۔ (در مختار و شامی)

۲۔ اگر سونا چاندی کے علاوہ کوئی اور سامان اپنے استعمال کے واسطے لیا تھا پھر تجارت کا اور اس کو فروخت کرنے کا ارادہ ہو گیا مگر فروخت نہیں ہوا اور سال گزر گیا تو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ کیونکہ نیت وہ معتبر ہے جو مال لیتے وقت ہو، اور یہاں مال لیتے وقت تجارت کی نیت نہیں تھی اس لئے یہ مال تجارت نہیں۔ ہاں جب اس کی فروخت شروع کر دے اس وقت سے تجارتی مال قرار پائے گا اور اس وقت کے بعد اگر سال بھر یہ مال رہا تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ (ہدایہ)

۳۔ دوکان میں جو الماریاں وغیرہ سامان رکھنے کے لئے رکھی ہوں، یا فرنیچر وغیرہ استعمال کے لئے رکھا ہو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں کیونکہ یہ مال تجارت نہیں البتہ اگر فرنیچر ہی کی تجارت کرتا ہو یعنی یہ فرنیچر تجارت کی نیت سے ہی خریدا یا بنوایا ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ مال مالی تجارت ہے۔ (در مختار ج ۲ و شامی)

۴۔ اگر کسی کے پاس کئی مکان ہوں اور ان کو کرایہ پر چلاتا ہو تو ان مکانوں کی قیمت پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں، خواہ وہ کتنی ہی قیمت کے ہوں، البتہ ان کے کرایہ سے حاصل شدہ رقم جس قدر سال بھر کے ختم تک باقی رہے گی اس کی زکوٰۃ نقد روپیہ کے حساب سے ادا کرنا ضروری ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے مثلاً ایک دو ہزار یا زائد روپے کے برتن، فرنیچر، شامیانے، یا سانکلیں وغیرہ یا کوئی اور سامان کرایہ پر دینے کے لئے خریدا اور کرایہ پر چلاتا رہا تو ان چیزوں پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں۔ کیونکہ کرایہ پر چلانے سے مال مالی تجارت نہیں بنتا۔ اور اس پر زکوٰۃ فرض

نہیں ہوتی۔ البتہ کرایہ سے جو روپیہ حاصل ہوگا اس کا وہی حکم ہے جو نقد روپیہ کا ہے۔ یعنی یہ روپیہ اگر بقدر نصاب ہو، اور ایک سال گزر جائے تو اس روپیہ پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ (ہدایہ و تاضی خان)

۵۔ پرنٹنگ پریس، کارخانوں اور ملوں وغیرہ میں جو مشینیں فٹ ہوں وہ بھی مال تجارت نہیں، لہذا ان پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں۔ البتہ اگر مشینیں تجارت کی نیت سے خریدی ہوں کہ ان کو فروخت کیا کریں گے تو ان پر بھی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ درزی کی کپڑے سینے کی مشینیں، ڈرائی کلین وغیرہ کی مشینوں کا اور ہر قسم کی مشینوں کا یہی حکم ہے۔ (در مختار و شامی)

۶۔ کارخانہ زائر مل وغیرہ کی مشینوں پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ لیکن ان میں جو مال تیار ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح جو خام مال مل میں سامان تیار کرنے کے لئے رکھا ہے اس پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔ خام مال اور تیار شدہ مال سب کی قیمت لگا کر اس کا ڈھائی فی صد زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ (در مختار و شامی)

۷۔ کسی کے پاس کچھ سونایا چاندی، اور کچھ مال تجارت ہے، لیکن علیحدہ علیحدہ نہ سونا چاندی بقدر نصاب ہے اور نہ مال تجارت بقدر نصاب ہے تو سب ملا کر دیکھیں اگر اس مجموعہ کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو جائے تو زکوٰۃ فرض ہوگی اور اگر پھر بھی کم رہے تو زکوٰۃ فرض نہیں۔ (ہدایہ)

۸۔ ملوں اور کمپنیوں کے شیئرز پر بھی ختم سال کے وقت جو قیمت شیئرز کی بازار میں ہو اس کے موافق زکوٰۃ فرض ہے۔ البتہ کمپنیوں کے شیئرز کی قیمت میں چونکہ مشینری اور مکان اور فرنیچر کی لاگت بھی شامل ہوتی ہے۔ جو درحقیقت

زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے اس لئے اگر کوئی شخص کمپنی سے دریافت کر کے جس قدر رقم اس کی مشینری اور مکان اور فرنیچر وغیرہ میں لگی ہوئی ہے۔ اس کو اپنے حصہ کے مطابق شیئرز کی قیمت میں سے کم کر کے باقی کی زکوٰۃ دے تو یہ بھی جائز و درست ہے۔ مثلاً شیئرز کی قیمت ایک سو روپیہ ہے اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ پانچ فیصد رقم مشینری اور مکان و دوکان اور اس کے فرنیچر میں لگی ہے تو شیئرز کی قیمت سے پانچ کم کر کے باقی چھانوے کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ (در مختار و شامی)

مقروض پر زکوٰۃ کب فرض ہے کب نہیں؟

۱۔ کسی کے پاس دو سو روپے ہیں اور اتنے ہی روپے کا وہ مقروض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ چاہے وہ دو سو روپے پورے سال اس کے پاس رکھے ہیں۔ اور اگر ڈیڑھ سو روپے کا مقروض ہے تو پھر بھی زکوٰۃ فرض نہیں۔ کیونکہ ڈیڑھ سو روپے قرض کے ہونے تو صرف پچاس روپے ضرورت سے زائد نہ بنے۔ اور پچاس روپے آج کل ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے کم ہیں۔

(ہدایہ و شامی)

۲۔ اگر کسی کے پاس پانچ سو روپے ہیں۔ اور دو سو روپے کا وہ قرض دار ہے تو اس پر تین سو روپے کی زکوٰۃ فرض ہے۔ (ہدایہ و شامی)

قرض خواہ پر زکوٰۃ کب فرض ہے کب نہیں؟

۱۔ اگر آپ کا مال کسی کے ذمہ قرض ہے تو اس مال کی زکوٰۃ بھی آپ پر

فرض ہے۔ بشرطیکہ قرض دار اس کا اقرار کرتا ہو اور ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہو۔ یا اگر وہ انکار کرے تو آپ کے پاس کوئی شہادت یا دستاویزی ثبوت ایسا موجود ہو جس کے ذریعہ آپ بذریعہ عدالت وصول کر سکتے ہوں۔ لیکن قرض کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ نقد روپیہ یا سونا چاندی کسی کو قرض دیا۔ یا تجارت کا مال کسی کو فروخت کیا تھا اور اس کی قیمت اس کے ذمہ باقی ہے۔ پھر یہ مال ایک سال یا دو تین سال کے بعد وصول ہوا۔ ایسے قرض کو فقہاء کی اصطلاح میں دین قوی کہا جاتا ہے ایسا قرض اگر بقدر نصاب یعنی ساڑھے باون تول چاندی کی قیمت کی برابر ہو تو وصول ہونے پر پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ دینا فرض ہے لیکن اگر یکمشت وصول نہ ہو بلکہ تھوڑا تھوڑا وصول ہو تو جب مقدار نصاب کا پانچویں حصہ (۱/۵) یعنی بیس (۲) فیصد وصول ہو جائے تو صرف اس پانچویں حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہوگا۔ پھر جب اور پانچواں حصہ وصول ہو جائے تو اس پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اور اسی طرح ہر پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوتی رہے گی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ زکوٰۃ پورے سالوں کی نکالی جائے گی۔

اور اگر یہ پورا قرض بقدر نصاب نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، البتہ اگر آپ کے پاس کچھ اور مال بھی ہے اور دونوں ملا کر بقدر نصاب ہو جائیں تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ (شامی جلد ۲ ص ۵۳)

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ وہ قرض روپے کی صورت میں دیا گیا ہو نہ سونا

(۱) یعنی ساڑھے دس تول چاندی کی قیمت کے برابر۔ ۱۲ منہ

(۲) یعنی مقدار نصاب کا بیس فیصد۔

چاندی کی صورت میں، اور نہ مال تجارت فروخت کیا ہو بلکہ کوئی اور چیز فروخت کی تھی یہ تجارت کی نہ تھی، مثلاً پہننے کے کپڑے یا گھر کا سامان، یا کوئی زمین فروخت کی تھی اور اس کی قیمت باقی ہے۔ ایسے قرض کو اصطلاح میں دین متوسط کہتے ہیں تو یہ قیمت اگر بقدر نصاب ہے اور کئی سال کے بعد وصول ہوئی تو وصول ہونے پر ان تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا اس پر بھی فرض ہو گیا اور اگر یکمشت وصول نہ ہو تو جب تک یہ قرض پورے مقدار نصاب کی برابر وصول نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ ادا کرنا فرض نہیں ہوتا جب بقدر نصاب وصول ہو جائے تو وصول شدہ رقم پر پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ دینا فرض ہے۔

(شامی و درم ۵۳ ص ۵۳ ج ۲)

مسئلہ: اس دوسری قسم کا قرض اگر یکمشت وصول نہ ہو بلکہ مثلاً پہلی مرتبہ ۵ روپے ملے تو اگر آپ کے پاس پہلے سے ایسا مال بقدر نصاب موجود ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے مثلاً ایک سو پندرہ روپے پہلے سے موجود ہیں تو یہ پندرہ روپے اس موجود روپے کے ساتھ ملا کر حساب ہوگا۔ چنانچہ حسب ان ایک سو پندرہ روپے کا سال پورا ہوگا تو یہ سمجھا جائے گا کہ قرض سے وصول ہونے والے پندرہ روپے پر بھی پورا سال گزر گیا، لہذا پورے ایک سو تیس روپے کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔

(۳) تیسری قسم یہ ہے کہ نہ نقد روپیہ قرض دیا نہ سونا چاندی دی، اور نہ کوئی چیز فروخت کی بلکہ کسی اور سبب سے آپ کا قرض دوسرے کے ذمہ ہو گیا مثلاً عورت کا مہر شوہر کے ذمہ ہو، یا شوہر کا بدل کے خلع عورت کے ذمہ ہو یا دیت (خوں بہا) کسی کے ذمہ ہو یا ملازم کی تنخواہ ادا کرنا باقی ہو۔ ایسے قرض کو

فقہاء دین ضعیف کہتے ہیں اور اس قسم کا حکم یہ ہے کہ اس کا حساب وصول ہونے کے دن سے ہوگا۔ پچھلے سالوں کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔ چنانچہ وصول ہونے کے بعد اگر اس پر ایک سال گزر گیا تو اس سال کی زکوٰۃ فرض ہوگی ورنہ نہیں۔

(شامی ج ۲ ص ۵۴)

مسئلہ: پراویڈنٹ فنڈ تیسری قسم میں داخل ہے۔ لہذا ملازمت چھوڑنے کے بعد جب اس فنڈ کا روپیہ وصول ہوگا اسی وقت سے اس روپیہ کے سال کی ابتدا ہوگی۔ اور پچھلے سالوں کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔

اطلاع اس مسئلہ میں بعض علماء کا اختلاف ہے وہ اس کو دین قوی یا متوسط قرار دے کر اس پر بھی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ لازم کرتے ہیں۔ اس لئے احتیاطاً کوئی ادا کرے تو افضل ہے۔ اس مسئلہ کی مکمل تحقیق و دلائل کے ساتھ دیکھنا ہو تو ضمیمہ امداد الفتاویٰ جلد دوم میں ملاحظہ فرمائیں (۱)۔

سال پورا ہونے سے پہلے زکوٰۃ دیدی تو اس کا حکم

۱۔ اگر کوئی مالدار کہ جس پر زکوٰۃ فرض ہے سال گذرنے سے پہلے ہی زکوٰۃ دیدے تو یہ جائز ہے، اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ اور اگر وہ فی الحال مال دار نہیں بلکہ کہیں سے مال ملنے کی امید پر سال ملنے سے پہلے ہی زکوٰۃ دے دی تو یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔ جب مال مل جائے اور اس پر سال گزر جائے تو دوبارہ زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ (ہدایہ ج اول)

(۱) اور پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ مال دار شخص اگر کئی سال کی زکوٰۃ پیشگی دیدے تو یہ بھی جائز ہے البتہ اگر کسی سال مال بڑھ گیا تو اس بڑھے ہوئے مال کی زکوٰۃ علیحدہ دینا ہوگی۔

(در مختار، شامی)

۳۔ کسی کے پاس ایک سو بیس روپے ضرورت سے زائد رکھے ہیں اور سو روپے مزید ملنے کی امید ہے۔ اس لئے پورے دو سو بیس روپے کی زکوٰۃ دے دی تو یہ بھی جائز ہے۔ لیکن ختم سال پر روپیہ اگر نصاب سے کم رہ گیا مثلاً صرف سو روپے باقی رہ گئے تو، زکوٰۃ معاف ہوگئی اور وہ دیا ہوا صدقہ نفلہ ہو گیا۔ اس کا ثواب ملے گا۔ (در مختار و شامی ج اول)

سال مکمل ہونے کے بعد مال ختم یا کم ہو جانے کا حکم

۱۔ کسی کے مال پر پورا سال گزر گیا لیکن ابھی زکوٰۃ نہیں دی تھی کہ تمام مال چوری ہو گیا، یا کسی اور طریقے سے خود بخود ضائع ہو گیا تو زکوٰۃ معاف ہوگئی۔ لیکن اگر اپنا مال اپنے اختیار سے کسی کو دے دیا یا کسی اور طرح اپنے اختیار سے ضائع کر دیا تو جس قدر زکوٰۃ فرض ہوئی تھی وہ معاف نہیں ہوگی بلکہ دینا پڑے گی۔

(ہدایہ و در مختار ج ۲)

۲۔ سال پورا ہونے کے بعد کسی نے زکوٰۃ کی نیت کے بغیر تمام مال خیرات کر دیا تو اس صورت میں بھی زکوٰۃ معاف ہوگئی۔ (ہدایہ ج اول)

۳۔ کسی کے پاس مثلاً چار سو روپے تھے ایک سال گذرنے کے بعد اس میں سے دو سو روپے چوری ہو گئے یا خیرات کر دیئے تو دو سو روپے کی زکوٰۃ دینا ہوگی۔

(در مختار ج ۲)

زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ اور اس کا حکم

۱۔ جب مال پر پورا سال گزر جائے تو فوراً زکوٰۃ ادا کر دینی چاہئے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اچانک موت آجائے اور یہ فریضہ گردن پر رہ جائے۔ اگر سال گزرنے پر زکوٰۃ نہیں دی۔ یہاں تک کہ دوسرا سال بھی گزر گیا تو یہ گناہ ہے، اس سے توبہ کرنی چاہئے۔ اور دونوں سالوں کی زکوٰۃ ادا کر دینی چاہئے۔ غرض یہ کہ زکوٰۃ دینے میں تاخیر کرنا اگرچہ گناہ ہے۔ لیکن یہ جب بھی دی جائے گی ادا ہوگی قضا نہیں کہلائے گی۔ (در مختار ج ۲)

۲۔ جس قدر مال ہے اس کا چالیسواں حصہ (۴۰/۱) دینا فرض ہے یعنی ڈھائی فی صد مال دیا جائے گا۔ (در مختار ج ۲)

۳۔ زکوٰۃ کی رقم دینے میں اختیار ہے کہ چاہے ایک ہی مستحق کو پوری رقم دیدیں۔ یا کئی غریبوں میں تقسیم کر دیں، نیز یہ بھی اختیار ہے کہ چاہے ایک دن میں پوری رقم دیدیں یا تھوڑا تھوڑا کر کے کئی مہینے میں دیں۔ (در مختار ج ۲)

۴۔ بہتر یہ ہے کہ ایک غریب کو کم از کم اتنا دیں کہ اس روز کے لئے کافی ہو جائے، اس روز کے لئے اسے کسی اور سے مانگنا نہ پڑے۔ (در مختار ج ۲)

۵۔ ایک ہی فقیر کو اتنا مال دے دینا کہ جتنے مال پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے مکر وہ ہے، لیکن اگر دے دیا تو زکوٰۃ ادا ہو گئی اور اس سے کم دینا بغیر کراہت کے جائز ہے۔ (ہدایہ ج ۱)

۶۔ کسی کے پاس چاندی کا اتنا زیور ہے کہ حساب سے تین تولہ چاندی زکوٰۃ ہوتی ہے تو اختیار ہے کہ زکوٰۃ میں چاہے تین تولہ چاندی دے دیں یا تین تولہ چاندی کی قیمت یا اس قیمت کا کوئی اور سامان دے دیں یہی حکم سونے کا ہے کہ اسکی زکوٰۃ چاہے خود سونے میں سے دیدیں یا قیمت کے برابر کوئی چیز دے دیں۔

۷۔ زکوٰۃ کے ادا ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ جو رقم کسی مستحق زکوٰۃ کو بہ نیت زکوٰۃ دی جائے، وہ اس کی کسی خدمت وغیرہ کے معاوضہ میں نہ ہو۔

مسئلہ: اسی لئے کسی مسجد کے امام، مؤذن، یا مدرسہ کے مدرس ملازم کو جو رقم دی جائے اس کا ثواب تو بڑا ہے مگر وہ زکوٰۃ میں شمار نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ اس کی خدمت کے معاوضہ میں ہے۔ ہاں کوئی مؤذن، امام، مدرس یا اپنے گھر کا نوکر اگر غریب ہے اور تنخواہ میں اس کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو تنخواہ کے علاوہ زکوٰۃ کی رقم سے بھی اس کی امداد کی جاسکتی ہے۔ اس صورت میں جو کچھ اس کو بہ نیت زکوٰۃ دیا جائے گا، زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کسی مستحق زکوٰۃ کو مالکانہ طور پر دیدی جائے جس میں اس کو ہر طرح کا اختیار ہو، اس کے مالکانہ قبضہ کے بغیر زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

مسئلہ: اسی لئے اگر زکوٰۃ کی نیت سے دس بیس مسکینوں کو بٹھا کر کھانا کھلادیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی کیونکہ اس کھانے کا ان کو مالک نہیں بنایا گیا۔

مسئلہ: مسجد، مدرسہ، خانقاہ، شفاخانہ، کنواں، پل یا اور کسی رفاہی ادارہ کی تعمیر میں رقم زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں اور اگر اس میں خرچ کر دی گئی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، کیونکہ اس میں بھی مستحق زکوٰۃ کو مالکانہ طور پر نہیں دیا گیا۔

مسئلہ: اسی طرح رقم زکوٰۃ سے کتابیں خرید کر کسی مدرسہ میں وقف کر دینا یا کوئی زمین خرید کر کسی رفاہ عام کے کام کے لئے وقف کر دینا بھی ادائیگی زکوٰۃ کے لئے کافی نہیں۔

مسئلہ: زکوٰۃ کی رقم سے مکانات بنا کر مستحقین زکوٰۃ کو بطور رعایت کے مفت رہنے کے لئے دے دینے سے بھی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، جب تک مکان کا ان کو مالک نہ بنادیا جائے۔

مسئلہ: شفا خانوں کی تعمیر اور اس کی ضروریات اور ملازمین کی تنخواہوں میں زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جاسکتی، البتہ دوائیں جو مستحقین زکوٰۃ کو مفت دی جائیں وہ زکوٰۃ میں لگ سکتی ہیں۔

مسئلہ: بعض حضرات زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کی رقم اس کام کے لئے جمع رکھتے ہیں کہ اس سے غریب مسلمانوں کو قرض حسنہ دیا جائے اور پھر وقت پر وصول کر لیا جائے۔ ایسا کرنا ثواب تو ضرور ہے مگر زکوٰۃ اس طرح ادا نہیں ہوتی جب تک مستحقین کو وہ مالکانہ طور پر نہ دے دی جائے۔

مسائل مذکورہ کی مزید تفصیل اور قرآن و سنت سے ان کا ثبوت رسالہ ”قرآن میں نظام زکوٰۃ“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

زکوٰۃ کی نیت

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے نیت زکوٰۃ فرض ہے، اور جس وقت زکوٰۃ کا روپیہ وغیرہ کسی غریب مستحق کو دیں اس وقت دل میں یہ نیت ضرور کر لیں کہ

”میں زکوٰۃ ادا کرتا ہوں“ صرف دل سے نیت کر لینا کافی ہے زبان سے کہنا نہ ضروری ہے نہ بہتر۔ اور اگر دل میں نیت نہ کی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ دوبارہ دینا پڑے گی اور یہ جو روپیہ بغیر نیت کے دیا ہے اس کا ثواب نفلی عہدہ کا ہوگا۔ (در مختار ج ۲)

۲۔ اگر کسی مستحق زکوٰۃ کو زکوٰۃ دیتے وقت نیت نہیں کی تو جب تک وہ مال اس غریب کے پاس موجود ہے اس وقت تک بھی یہ نیت کر لینا درست ہے۔ اس نیت کرنے سے بھی وہ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، البتہ فقیر کے پاس وہ مال خرچ ہو جانے کے بعد نیت کی تو اس نیت کا اعتبار نہیں۔ اس دوبارہ زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ (در مختار ج ۲)

۳۔ جس کو زکوٰۃ دی جائے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ زکوٰۃ ہے پیسے ہیں۔ بلکہ اس کا نہ جتنا نا ہی بہتر ہے۔ (در مختار ج ۲)

۴۔ کسی نے زکوٰۃ کی نیت سے مثلاً دس روپیہ نکال کر الگ رکھ لئے کہ جب کوئی مستحق ملے گا تو دس روپیہ دوں گا۔ پھر مستحق کو دیتے وقت نیت کرنا بھول گیا تو زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ البتہ اگر زکوٰۃ کی نیت سے نکال کر علیحدہ نہ رکھتا تو ادا نہ ہوتی، عرض یہ کہ زکوٰۃ کی نیت خواہ روپیہ نکال کر علیحدہ رکھتے وقت کر لے یا فقیر کو دیتے وقت کر لے، دونوں طرح ٹھیک ہے۔ لیکن اگر دونوں وقت نیت نہ کی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ (ہدایہ ج ۱)

۵۔ کسی نے قرض مانگا، اور معلوم ہے کہ وہ اتنا تنگ دست اور مفلس ہے کہ کبھی ادا نہ کر سکے گا یا ایسا ناہندہ ہے کہ قرض لے کر کبھی ادا نہیں کرتا، اس کو قرض کے نام سے زکوٰۃ کا روپیہ دے دیا۔ اور دل میں زکوٰۃ کی نیت کر لی تو زکوٰۃ

ادا ہو گئی، اگرچہ لینے والا یہی سمجھے کہ مجھے قرض دیا ہے۔ (عائلیہ)

۶۔ اگر کسی کو انعام کے نام سے کچھ دیا لیکن دل میں یہ نیت کر لی کہ زکوٰۃ دیتا ہوں تو زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ اسی طرح کسی غریب یا ان کے بچوں کو عیدی یا تحفہ کے طور پر زکوٰۃ کی رقم دے دی تو زکوٰۃ ادا ہو گئی اگرچہ وہ یہ سمجھیں کہ ہمیں تحفہ دیا ہے اور عزیزوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا افضل و بہتر ہے تاکہ ان کو لینے میں شرمندگی نہ ہو۔ (در مختار و عائلیہ)

۷۔ کسی غریب آدمی پر آپ کے مثلاً دس روپے قرض ہیں، اور آپ کے مال کی زکوٰۃ بھی دس روپے یا اس سے زائد ہے، تو اگر آپ نے اپنا قرض اس کو زکوٰۃ کی نیت سے معاف کر دیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی البتہ اگر اس کو دس روپے زکوٰۃ کی نیت سے دے دیں تو زکوٰۃ ادا ہو گئی، اب یہی روپے اپنے قرض میں اس سے لے لینا درست ہے۔ (در مختار ج ۲)

کسی اور شخص کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرنا

۱۔ آپ کسی دوسرے شخص یا ادارہ کو اپنی زکوٰۃ کی رقم دے کر وکیل و مختار بنا سکتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف سے مال زکوٰۃ کو زکوٰۃ کے صحیح مصرف میں خرچ کر دے لیکن اس میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، اول تو یہ کہ اس وکیل پر یہ پورا اعتماد ہو کہ وہ اس رقم کو صرف مستحقین زکوٰۃ ہی پر صرف کرے گا، دوسری مدت خیرات میں خرچ نہ کر ڈالے گا، دوسری یہ کہ جب تک آپ کا مال زکوٰۃ اس وکیل کے قبضہ میں رہے گا وہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کے پاس رکھا ہے، زکوٰۃ اسی وقت ادا ہوگی جب یہ شخص یا ادارہ مال زکوٰۃ کو مستحقین زکوٰۃ میں خرچ کر

ڈالے۔ بہت سے ادارے زکوٰۃ کی رقم جمع کر لیتے ہیں اور سالہا سال رقم زکوٰۃ رکھی رہتی ہے۔ صرف نہیں ہوتی۔ یہ بڑی بے احتیاطی ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کا روپیہ وغیرہ غریب کو اگر خود نہ دیا بلکہ کسی اور کو دیا کہ تم کسی غریب کو دے دینا تو اب وہ شخص غریب کو دیتے وقت اگر زکوٰۃ کی نیت نہ کرے تب بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ (عائلیہ)

۳۔ اگر آپ نے روپے نہیں دیئے لیکن اتنا کہہ دیا کہ تم ہماری طرف سے زکوٰۃ دے دینا اب اس نے آپ کی طرف سے زکوٰۃ دے دی تو یہ ادا ہو گئی۔ اور جو رقم اس نے دی ہے وہ آپ کے ذمہ اس کا قرض ہے۔ (شامی ج ۲)

۴۔ اگر آپ نے کسی سے کچھ نہیں کہا، بلکہ آپ کی اجازت کے بغیر کسی نے آپ کی طرف سے زکوٰۃ دے دی تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اب اگر آپ منظور بھی کر لیں تب بھی آپ کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی بلکہ یہ خود اس کی طرف سے نفلی صدقہ ہوگا۔ چنانچہ جو رقم اس نے دی ہے وہ آپ سے وصول کرنے کا بھی اسے حق نہیں۔ (شامی)

۵۔ آپ نے کسی شخص کو دو روپے دے اور کہا کہ میری طرف سے یہ زکوٰۃ میں دے دینا۔ اب اسے اختیار ہے کہ چاہے خود کسی غریب کو دے یا کسی اور کے سپرد کر دے کہ تم یہ روپیہ زکوٰۃ میں دے دینا اور نام بتانا بھی ضروری نہیں کہ فلاں شخص کی طرف سے یہ زکوٰۃ دیتا ہوں۔ (بہشتی زیور حصہ ۳ ص ۲۲)

۶۔ آپ نے کسی کو دو روپے دے کہ میری طرف سے یہ زکوٰۃ میں دے دینا تو وہ شخص اگر دو روپیہ اپنے کسی رشتہ دار یا ماں باپ کو غریب دیکھ کر دیدہ تو

جائز ہے۔ لیکن اگر وہ خود غریب ہے تو خود ہی لے لینا صحیح نہیں، البتہ اگر آپ نے یہ کہہ دیا ہو کہ ”جو چاہو کرو اور جسے چاہو دے دو“ تو وہ خود بھی لے لے تو درست ہے بشرطیکہ خود مستحق زکوٰۃ ہو۔ (در مختار ج ۲)

زکوٰۃ کن لوگوں کو دینا جائز ہے؟

۱۔ جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنی ہی قیمت یا مال تجارت ہو اس کو شرعاً مال دار کہا جاتا ہے، ایسے شخص کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اور ایسے شخص کو زکوٰۃ لینا بھی حلال نہیں۔ (عالمگیری)

۲۔ اسی طرح جس کے پاس اتنی ہی قیمت کا کوئی مال ہو جو مال تجارت تو نہیں لیکن ضرورت سے زائد ہے وہ بھی مال دار ہے ایسے شخص کو بھی زکوٰۃ دینا درست نہیں، اگرچہ خود اس قسم کے مال دار پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں۔

(بہشتی زیور حصہ ۲ ص ۲۳)

۳۔ اور جس کے پاس اتنا مال نہ ہو، بلکہ اس سے کم ہو یا بالکل نہ ہو اس کو ”فقیر“ کہتے ہیں، ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دینا درست ہے اور ان لوگوں کو لینا بھی جائز ہے۔ (در مختار ج ۲)

۴۔ بڑی بڑی ویکس، بڑی دریاں، شامیانے، جن کی کبھی برسوں میں تقریبات کے موقعوں پر ضرورت پڑتی ہے اور روزمرہ ضرورت نہیں ہوتی یہ سامان ضرورت سے زائد کہلائے گا چنانچہ جس کے پاس ایسا مال بقدر نصاب ہو اسے بھی زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ (شامی ج)

۵۔ رہائش کا مکان، پہننے کے کپڑے اور خدمت گار ملازم، اور گھر کا وہ سامان جو اکثر استعمال میں رہتا ہے، یہ سب ضروری سامان میں داخل ہیں۔ چنانچہ اس سامان کے ہونے سے کوئی شخص مال دار نہیں کہلائے گا، خواہ یہ مال کتنا ہی زیادہ قیمتی ہو، اس لئے اس کو زکوٰۃ دینا بھی صحیح ہے۔ اسی طرح پڑھنے لکھنے آدمی کے پاس اس کے مطالعہ میں آنے والی کتابیں بھی ضروری سامان میں داخل ہیں کارنگروں کے اوزار بھی ضروری سامان میں داخل ہیں، خواہ وہ کتنی ہی قیمت کے ہوں جب اس کے پاس اوزار کے علاوہ ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر مال موجود نہ ہو تو وہ مستحق زکوٰۃ ہے۔ (شامی ج ۲)

۶۔ کسی کے پاس چند مکان ہیں جو کرایہ پر چلتے ہیں یا کوئی اور آمدنی ہے، لیکن اہل و عیال اور بچے استے زیادہ ہیں کہ اچھی طرح گذر نہیں ہوتی، اور اس کے پاس کوئی ایسا مال بھی نہیں جس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، تو ایسے شخص کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ (شامی ج ۲)

۷۔ کسی کے پاس ایک ہزار روپیہ نقد موجود ہیں، لیکن وہ ایک ہزار یا اس سے زائد کا قرضدار بھی ہے تو اس کو بھی زیادہ دینا جائز ہے۔ اور اگر قرض ایک ہزار سے کم ہو تو دیکھیں کہ قرض ادا کر کے کتنے روپیے بچتے ہیں۔ اگر بقدر نصاب بچتے ہوں تو اسے زکوٰۃ دینا درست نہیں۔ اور اگر کم بچتے ہیں تو دینا درست ہے۔ (عالمگیری)

۸۔ ایک شخص بہت مال دار ہے، لیکن کہیں سفر میں اتفاق سے اس کے پاس سفر کے لئے کچھ نہیں بچا۔ تمام مال چوری ہو گیا اور کسی وجہ سے ختم ہو گیا یہاں تک کہ گھر پہنچنے کے لئے بھی سفر خرچ نہیں رہا تو ایسے شخص کو اس حالت

میں زکوٰۃ دینا درست ہے اگرچہ اس کے گھر میں کتنا ہی مال و دولت موجود (۱) ہو۔ اسی طرح اگر حاجی کے پاس راستہ میں خرچ کے لئے کچھ نہ رہا تو اسے بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اگرچہ اس کے گھر میں خوب مال و دولت موجود ہو۔ (عالمگیری)

۹۔ نابالغ بچوں کا باپ اگر مال دار ہو تو ان کو بھی زکوٰۃ نہیں دے سکتے لیکن اگر بچے بالغ ہو گئے اور خود وہ مال دار نہیں لیکن ان کا باپ مال دار ہے تو ان کو زکوٰۃ دینا درست ہے۔ (عالمگیری)

۱۰۔ اگر نابالغ بچوں کا باپ تو مال دار نہیں لیکن ماں مال دار ہے تو ان بچوں کو زکوٰۃ دینا درست ہے۔ (در مختار ج ۲)

۱۱۔ بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اور بنو ہاشم وہ لوگ ہیں جو سید یعنی حضرت فاطمہ زہراؑ کی اولاد میں سے ہوں یا علوی ہوں، یا حضرت عباسؑ، یا حضرت جعفرؑ یا حضرت عقیلؑ یا حضرت حارث ابن عبدالمطلب کی اولاد میں ہوں۔ (بدیع ج ۱)

اسی طرح جو بھی صدقہ واجب ہو وہ ان کو نہیں دیا جاسکتا، مثلاً نذر، کفارہ، عشر، صدقہ فطر ان کو نہیں دے سکتے ہیں، البتہ نفلی صدقات و خیرات ان لوگوں کو دے سکتے ہیں۔ (در مختار و شامی)

۱۲۔ زکوٰۃ کسی کافر کو دینا درست نہیں، صرف مسلمان کو ہی دی جاسکتی ہے۔ عشر، صدقہ، فطر، نذر اور کفارہ کا بھی حکم ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے صدقات کافر کو بھی دے سکتے ہیں۔ (بہشتی زیور)

(۱) لیکن ایسے شخص کیلئے صرف بقدر ضرورت زکوٰۃ لینا جائز ہے ضرورت سے زائد لینا حلال نہیں۔ ۱۲ عالمگیری

مساجد، اسلامی مدارس، انجمنوں، اور جماعتوں کو زکوٰۃ دینے کے احکام

ان مسائل کا بیان پہلے بھی زکوٰۃ ادا کرنے کے طریقے میں آچکا ہے، مگر عام ضرورت کے پیش نظر اس جگہ پھر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

۱۔ زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک کسی مستحق کو اس کا مالک نہ بنادیا جائے، چنانچہ زکوٰۃ کے روپیہ سے مسجد بنوانا، یا کسی لادارث مردہ کے کفن و دفن کا انتظام کروینا، یا مردہ کی طرف سے اس کا قرض ادا کر دینا، درست نہیں کیونکہ یہاں کسی کو مالک بنانا نہیں پایا گیا۔ (در مختار ج ۲)

۲۔ زکوٰۃ کا روپیہ کسی ایسے مدرسہ یا انجمن میں دینا کہ جہاں وہ غریبوں پر خرچ نہ کیا جاتا ہو بلکہ ملازمین کی تنخواہوں یا تعمیر وغیرہ میں خرچ کر دیا جاتا ہو جائز نہیں۔ البتہ اگر کسی ادارہ میں غریب طلباء یا دوسرے مسکینوں کو کھانا وغیرہ مفت دیا جاتا ہے تو ایسے مدرسہ یا انجمن وغیرہ میں زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ لیکن یہ زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جب وہ روپیہ نقد یا اس روپیہ کے بدلہ میں کھانا وغیرہ غریبوں کو دے دیا جائے۔ یا کوئی اور چیز مثلاً کپڑے یا لحاف وغیرہ مالکانہ طور پر ان کو دیدیئے جائیں۔ (کافی عامۃ التون)

۳۔ کسی نے زکوٰۃ کے طور پر کچھ کپڑے یا کتابیں وغیرہ مدرسہ میں دیں تو اگر یہ کپڑے یا کتابیں طلباء کو مالکانہ طریقے پر دے دی گئیں کہ ان سے واپس نہ لی جائیں تو زکوٰۃ ادا ہوگئی ورنہ نہیں۔

۴۔ آج کل عربی مدارس میں کتابیں عموماً مالکانہ طریقے پر طلباء کو نہیں دی

جاتیں بلکہ عارضی طور پر صرف پڑھنے کے لئے دی جاتی ہیں، سال کے اختتام پر واپس لے لی جاتی ہیں، ایسی کتابیں بھی زکوٰۃ کی رقم سے خریدنا جائز نہیں۔ اسی طرح ایسے کپڑے، کمبل، لحاف وغیرہ بھی زکوٰۃ کی رقم سے خریدنا جائز نہیں جو طلباء کو مالکانہ طور پر نہیں دیئے جاتے بلکہ واپس لے لئے جاتے ہیں۔ البتہ اگر یہ کیا جائے کہ زکوٰۃ نکالنے والا شخص یہ کتابیں یا کمبل وغیرہ کسی مستحق زکوٰۃ کو مالکانہ طور پر دیدے کہ وہ جو چاہے کرے، پھر وہ شخص اپنی طرف سے بخوشی مدرسہ میں داخل کر دے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ چاہے اب وہ کتابیں وغیرہ طلباء کو مالکانہ طور پر نہ دی جائیں پھر بھی ادا ہو جائے گی۔ اس صورت میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ نکالنے والے کو تو زکوٰۃ نکالنے کا پورا ثواب ملے گا ہی، ساتھ ہی اس غریب کو بھی صدقہ نافلہ کا ثواب ہو گا جس نے یہ کتابیں کمبل وغیرہ لے کر مدرسہ میں دے دیے ہیں۔

۵۔ غریب طلباء کو مد زکوٰۃ سے تعلیم کے لئے وظائف دئے جاسکتے ہیں۔

۶۔ غریب طلباء کے لئے اسلامی مدارس میں زکوٰۃ دینے میں دو گنا ثواب ہے، ایک ثواب تو زکوٰۃ کا دوسرا ثواب اسلامی تعلیم کی اعانت کا۔ لیکن زکوٰۃ ایسے مدرسہ میں دینی چاہئے جس کے منتظمین پر پورا اعتماد ہو کہ وہ زکوٰۃ کی رقم کو خاص زکوٰۃ ہی کے صحیح مصرف میں یعنی غریب طلباء کی خوراک پوشاک وغیرہ میں اس طرح خرچ کریں گے کہ طلباء اس کے مالک قرار دیئے جائیں۔

شفاخانہ کی تعمیر اور دیگر ضروریات اور ملازمین کی تنخواہوں میں بھی زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں ہو سکتی البتہ جو دووائیں غریبوں کو مفت دی جائیں وہ زکوٰۃ میں شمار ہوں گی۔

تنبیہ

مساجد، مدارس اسلامیہ اور غریبوں کے لئے شفاخانے وغیرہ بنانا مسلمانوں کے لئے بڑے ضروری اور اہم کام ہیں ان میں خرچ کرنے کا اجر و ثواب بھی عظیم ہے مگر شریعت اسلام میں ان کے لئے بیت المال کے دوسری مدانت مقرر ہیں جن سے ان کاموں میں خرچ ہونا چاہئے۔ آج کل اسلامی بیت المال قائم نہ ہونے کے سبب مشکلات درپیش ہیں اس مجبوری کے باعث مسلمانوں کو زکوٰۃ کے علاوہ ان کاموں کے لئے مستقل چندہ کرنا ضروری ہو گیا، زکوٰۃ کی رقم بہر حال ان کاموں پر خرچ کرنا درست نہیں، بہت مجبوری کی حالت میں ایسا کیا جاسکتا ہے کہ کسی ایسے غریب مستحق زکوٰۃ کو رقم زکوٰۃ کا باقاعدہ مالک بنادیا جائے جو ان کاموں میں خرچ کرنے کی خواہش رکھتا ہے، مگر ناداری کے سبب عمل سے مجبور ہے، یہ شخص اپنے مالکانہ قبضہ میں لینے کے بعد اپنی رضا و رغبت سے یہ رقم کسی مسجد مدرسہ یا ادارے کو دیدے تو اس کی طرف سے یہ چندہ ہو گا، جو اداروں کے ہر کام پر خرچ ہو سکے گا۔ لیکن یاد رہے کہ حیلہ تمملیک کے نام سے جو کھیل عام طور پر کھیلا جاتا ہے اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ کیونکہ عموماً جس کو زکوٰۃ دی جاتی ہے وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ مجھے اس مال کا کوئی اختیار نہیں، محض زبانی جمع خرچ کرنا ہے۔ ایسی صورت میں نہ وہ مالک ہوتا ہے نہ زکوٰۃ دینے والے کی زکوٰۃ ادا ہوتی ہے۔ اس حیلہ سے رقم زکوٰۃ کو مساجد مدارس وغیرہ کی تعمیری ضروریات پر لگانا جائز نہیں ہوتا۔

مذکورہ مسائل کی تحقیق و تفصیل عربی کتب فقہ کے علاوہ رسالہ ”قرآن میں نظام زکوٰۃ“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

رشتہ داروں اور متعلقین کو زکوٰۃ دینا

۱۔ اپنی زکوٰۃ کاروپہ اپنے ہاں باپ، دادا دادی نانائانی یا دادا وغیرہ کہ جن کی اولاد سے یہ خود ہے دینا درست نہیں۔ اسی طرح اپنی اولاد، پوتے پوتی، نواسے نواسی، وغیرہ کہ جو اس کی اولاد میں داخل ہیں ان کو دینے سے بھی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اسی طرح شوہر اور بیوی بھی ایک دوسرے کو اپنی زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔

(ہدایہ ناول)

۲۔ مذکورہ رشتہ داروں کے سوا اور سب کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ مثلاً بھائی، بہن، بھتیجا بھتیجی، بھانجا، بھانجی، چچا، پھوپھی، خالہ، ماموں، سوتیلی ماں، سوتیلے باپ، سوتیلے دادا، سوتیلی دادی، خسر ساس وغیرہ سب کو دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں۔ (شامی ج ۲)

۳۔ زکوٰۃ اور دوسرے صدقات و خیرات دینے میں سب سے زیادہ اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھنا چاہئے اگر یہ غریب ہوں تو پہلے ان کو ہی دینا چاہئے۔ لیکن ان سے یہ نہ کہیں کہ یہ صدقہ یا زکوٰۃ کی چیز ہے۔ تاکہ انہیں شرمندگی نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ قرابت والوں کو خیرات و زکوٰۃ دینے سے دو گنا ثواب ملتا ہے۔ ایک ثواب تو خیرات کا، اور دوسرے اپنے عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک و احسان کا انہیں دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ اور لوگوں کو دیں۔ (عائلی)

۴۔ رضاعی^(۱) بیٹا، بیٹی، اور رضاعی ماں باپ کو بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

(۱) کوئی عورت اگر کسی دوسرے کے بچوں کو دودھ پلائے تو یہ بچے اس عورت کے رضاعی بیٹیاں بیٹیاں کہلاتے ہیں اور وہ عورت اور اس کا شوہر ان بچوں کے رضاعی ماں باپ کہلاتے ہیں۔ ۱۲ منہ

۵۔ گھریا دوکان وغیرہ کے ملازمین، دھوبی، ڈرائیور، دلایا آیا وغیرہ اگر غریب ہوں تو ان کو بھی زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی تنخواہ میں نہ لگائیں۔ بلکہ تنخواہ اور مزدوری سے زائد بطور انعام کے دیں، اور دل میں زکوٰۃ دینے کی نیت کر لیں تو درست ہے۔ ورنہ نہیں۔ (عائلی)

۶۔ ایک شہر کی زکوٰۃ دوسرے شہر میں بھیجنا مکروہ ہے۔ لیکن اگر دوسرے شہر میں اس کے رشتہ دار مستحق زکوٰۃ رہتے ہوں، یا یہاں کی بہ نسبت وہاں کے لوگ زیادہ ضرورت مند ہوں، تو ان کو بھیج دینا جائز ہے۔ اسی طرح اگر دوسرے شہر کے لوگ دین کے کام میں لگے ہیں مثلاً دینی مدارس کے طلباء یا دین دار علماء دین، یا مجاہدین اسلام ہوں اور وہ مستحق زکوٰۃ بھی ہوں تو ان کو بھی زکوٰۃ بھیجی جاسکتی ہے۔ بلکہ زیادہ ثواب ہے۔ (عائلی)

زکوٰۃ دینے میں غلطی ہو جائے تو اس کا حکم

۱۔ اگر کسی کو غریب و مستحق سمجھ کر زکوٰۃ دیدی، پھر معلوم ہوا کہ وہ تو ذمی کافر^(۱) ہے یا مال دار ہے، یا سید ہے، یا تاریک رات میں کسی کو دے دی۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ اس کی ماں، باپ، یا کوئی ایسا رشتہ دار ہے جس کو زکوٰۃ دینا اس کے لئے درست نہیں تو ان تمام صورتوں میں زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ دوبارہ دینا واجب نہیں۔ لیکن لینے والے کو اگر معلوم ہو جائے کہ زکوٰۃ کاروپہ ہے اور میں زکوٰۃ لینے کا مستحق نہیں ہوں تو اسے نہ لینا چاہئے اور واپس کر دینا چاہئے۔ (در مختار مع شامی)

(۱) ذمی وہ کافر ہے جو دارالاسلام کے شہری حقوق رکھتا ہو۔ اور غیر ذمی وہ کافر ہے جو دارالاسلام کے شہری حقوق نہ رکھتا ہو۔ ۱۲ منہ

۲۔ اگر زکوٰۃ دینے کے بعد معلوم ہوا کہ جس کو دی ہے وہ غیر ذمی کافر ہے۔
تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔ پھر ادا کریں (در مختار و ہدایہ)

۳۔ اگر کسی کے بارے میں شک ہو کہ معلوم نہیں مال دار ہے یا نہیں تو جب تک تحقیق نہ ہو جائے اس وقت تک اس کو زکوٰۃ نہ دیں: لیکن اگر بغیر تحقیق کئے اسے دے دی تو اب اندازہ کریں، اگر غالب گمان یہ ہو کہ غریب ہے تو زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ اور اگر غالب گمان یہ ہو کہ مال دار ہے تو ادا نہیں ہوئی دوبارہ زکوٰۃ دیں۔ (شامی ج ۲)

متفرقات

۱۔ کسی عورت کا مہر نصاب زکوٰۃ کے برابر یا زائد ہے۔ اور یہ امید ہے کہ جب مہر طلب کرے گی شوہر بلا تامل دیدے گا تو ایسی عورت کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، لیکن اگر اس کا شوہر اتنا غریب ہے کہ مہر ادا نہیں کر سکتا، یا مال دار تو ہے لیکن نہیں دیتا، تو ایسی عورت کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اسی طرح اگر اس نے مہر معاف کر دیا ہو تو پھر بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ (در مختار ج ۲)

تنبیہ

عام طور سے لوگ صرف اسی کو فقیر سمجھتے ہیں جو بھیک مانگتا ہو۔ حالانکہ بعض اوقات باعزت لوگ زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ مگر شرم کی وجہ سے اپنی غربت نہ اپنے لباس سے ظاہر ہونے دیتے ہیں نہ زبان سے کہتے ہیں۔ دیکھنے سے

بظاہر وہ غریب معلوم نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات وہ تنخواہ دار ملازم بھی ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ عیال ہونے کی وجہ سے بہت تنگ دست رہتے ہیں۔ اگر تحقیق سے کسی ایسے شخص کا علم ہو جائے تو اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے، ایسے لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات دینا زیادہ باعث ثواب ہے۔ کیونکہ بھیک مانگنے والا تو کہیں اور سے بھی مانگ لے گا۔ لیکن یہ غریب شرم و خودداری کی وجہ سے کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں مانگ سکتا۔

زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ (عشر) کا بیان

عشر اور عشری زمین کی تعریف

جو زمین مسلمانوں نے کفار سے جنگ کر کے فتح کی ہو اور فتح کر کے مسلمانوں کے امیر نے وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دی ہو وہ زمین، عشری کہلاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی جگہ کے کافر باشندے خود بخود ہی بغیر جنگ کے مشرف باسلام ہو گئے ہوں تو ان کی زمین بھی عشری کہلاتی ہے۔

لیکن اگر وہ زمین جنگ کر کے فتح نہیں کی گئی بلکہ بغیر جنگ کے صرف صلح سے فتح ہو گئی۔ اور زمین ان کے کافر مالکوں ہی کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی تو وہ زمین عشری نہیں۔ اسی طرح اگر وہ زمین جنگ کر کے فتح تو کی ہے، لیکن مسلمانوں میں تقسیم نہیں کی گئی بلکہ وہیں کے کافر باشندوں کی ملکیت میں رہنے دی تو وہ زمین بھی عشری نہیں۔ (ہدایہ ص ۷۰ ج ۲)

مسئلہ: اگر کسی کے آباؤ اجداد سے عشری زمین پشت در پشت چلی آتی

ہو۔ یا کسی ایسے مسلمان سے اس نے خریدی ہو جس کے پاس اس کے آباؤ اجداد سے عشری زمین اسی طرح چلی آتی ہو تو ایسی زمین کی پیداوار پر بھی زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، اور اس زکوٰۃ کو عشر کہا جاتا ہے۔ (شامی ص ۷۴-۲)

مسئلہ: پاکستان میں جو ہندوؤں کی متروکہ زمینیں مہاجرین کو ان کے کلیم کے معاوضہ میں ملی ہیں یا کسی مہاجر کو یا کسی ادارہ کو حکومت پاکستان نے بلا معاوضہ ہی دے دی ہیں۔ یہ سب زمینیں عشری ہیں۔ اگر بارانی ہوں تو دسواں حصہ اور نہری یا چاہی ہوں تو بیسواں حصہ پیداوار کا صدقہ کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: اگر عشری زمین کوئی کافر خرید لے تو وہ عشری نہیں رہتی۔ پھر اس سے اگر مسلمان خرید لے یا کسی اور طریقہ سے مسلمان کو مل جائے تب بھی وہ عشری نہ ہوگی۔ لہذا اس پر عشر بھی واجب نہ ہوگا۔ (در مختار ج ۲)

زکوٰۃ اور عشر میں فرق

زکوٰۃ اور عشر کے احکام میں چھ اعتبار سے فرق ہے۔

(۱) عشر واجب ہونے میں کسی نصاب کی شرط نہیں۔ چنانچہ پیداوار کم ہو یا زیادہ بہر حال اس پر عشر فرض ہوگا۔ البتہ اگر پیداوار پونے دو سیر (نصف صاع) سے بھی کم ہو عشر فرض نہیں۔ (در مختار و شامی ج ۲)

(۲) عشر میں پیداوار پر ایک سال گزرنے کی بھی شرط نہیں، چنانچہ اگر کسی زمین میں سال میں دو مرتبہ فصل ہوتی ہے۔ یا کسی درخت پر سال میں دو مرتبہ پھل آتا ہے تو ہر مرتبہ کی پیداوار میں عشر فرض ہوگا۔ (در مختار و شامی ج ۲)

(۳) عشر فرض ہونے میں عاقل ہونے کی بھی شرط نہیں لہذا مجنون کے مال پر بھی عشر فرض ہوتا ہے۔ (در مختار و شامی ج ۲)

(۴) اس میں بالغ ہونے کی بھی شرط نہیں۔ چنانچہ نابالغ کے مال پر بھی عشر فرض ہوتا ہے۔ (در مختار و شامی ج ۲)

(۵) عشر کے لئے آزاد ہونا بھی شرط نہیں، چنانچہ غلام کے مال پر بھی عشر فرض ہوتا ہے۔ (در مختار و شامی ج ۲)

(۶) زمین کا مالک ہونا بھی شرط نہیں، چنانچہ اگر وقفہ زمین میں اہل وقفہ کاشت کریں تو اس پیداوار پر بھی عشر فرض ہوگا۔ اسی طرح اگر زمین کرایہ پر ملے کر اس میں کاشت کریں تو اس پیداوار پر بھی عشر فرض ہوگا۔

(ہذا کاظم سن رد المحتار ص ۷۵ ج ۲)

کس قسم کی پیداوار پر عشر ہے اور کتنا؟

۱۔ زکوٰۃ عشر صرف عشری زمینوں پر واجب ہے۔ دوسری قسم کی زمینیں جن کو خراجی کہا جاتا ہے، ان پر عشر واجب نہیں، بلکہ ان کا خراج وصول کرنا حکومت کا کام ہے۔ (ہدایت)

۲۔ خراجی زمینوں کی سرکاری مال گزاری جو حکومت وصول کر لیتی ہے۔ اس سے خراج ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن عشری زمینوں کی سرکاری مال گزاری ادا کرنے سے عشر ادا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حکومت نے اس کو عشر کہہ کر وصول کرتی ہے نہ عشر کے مخصوص مضارف میں صرف کرنے کا وعدہ کرتی ہے، اس لئے

مسلمانوں کو عشری زمینوں کا عشر سرکاری مال گزاری کے علاوہ ادا کرنا اور مصارف زکوٰۃ پر صرف کرنا ضروری ہے۔

۳۔ جو زمینیں بارانی ہیں یعنی صرف بارش کے پانی سے ان میں پیداوار ہوتی ہے نہریا کنویں وغیرہ سے آب پاشی نہیں کی جاتی ان کی پیداوار کا عشر یعنی دسواں حصہ اس کی زکوٰۃ ہے جس کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ اسی طرح ایسی زمینیں جن کی کھیتی کسی ندی نالہ کے کنارہ پر گہرائی میں ہونے کی وجہ سے خود بخود زمین کے پانی سے سیراب ہو جاتی ہے جن کو عرف میں کھادر کی زمینیں بولتے ہیں ایسی زمینوں کا بھی وہی حکم ہے جو بارانی زمینوں کا یعنی پیداوار کا دسواں حصہ ان کی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ (ہدایہ)

۴۔ اور نہری یا چاہی زمینیں جو سرکاری نہر کے پانی سے یا کنویں کے پانی سے سیراب کی جاتی ہیں، ان میں پیداوار کا بیسواں حصہ ان کی زکوٰۃ ہے جو حقیقت میں تو نصف عشر ہے۔ مگر اصطلاحاً اس کو بھی عشر کہہ دیا جاتا ہے۔ (ہدایہ)

۵۔ باغات کے احکام بھی اس معاملہ میں وہی ہیں جو زرعی زمینوں کے اوپر بتلائے گئے ہیں کہ بارانی زمینوں کے باغ کی پیداوار میں دسواں حصہ اور نہری یا چاہی باغ کی پیداوار میں بیسواں حصہ زکوٰۃ عشر کا واجب ہے۔ (عالمگیری)

۶۔ گنا۔ پھل۔ ترکاری۔ اناج۔ پھول وغیرہ جو کچھ پیدا ہو سب کا بھی حکم ہے۔ (عالمگیری)

۷۔ جو زمین کسی کو ٹھیکہ یا مقاطعہ پر معینہ رقم کے معاوضہ میں دی گئی ہو اس کی پیداوار کا عشر ٹھیکہ دار کے ذمہ ہے۔ مالک زمین کے ذمہ نہیں۔ اور جو بٹائی

پردی جائے اس کا عشر مالک زمین اور اس کاشت کار دونوں پر اپنے حصہ پیداوار کے مطابق ہے۔ (از بہشتی زیور حکیم الامتہ تھانوی)

۸۔ عشری زمین یا پہاڑ یا جنگل سے اگر شہد نکالا تو اس میں بھی عشر (دسواں حصہ) دینا فرض ہے۔ (در مختار ج ۲)

۹۔ کسی نے اپنے گھر میں کوئی درخت یا ترکاری وغیرہ بوئی اور اس میں پھل وغیرہ آیا تو اس میں عشر فرض نہیں۔ (عالمگیری)

۱۰۔ جن لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز ہے انہی کو عشر دینا بھی جائز ہے۔ اور جنہیں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی انہیں عشر بھی نہیں دے سکتے۔ (دروشامی ج ۲)

۱۱۔ زکوٰۃ کی طرح عشر میں بھی اختیار ہے کہ چاہے بچہ اسی پیداوار میں سے یہ صدقہ نکال دیں اور چاہے اس صدقہ کی قیمت ادا کر دیں مثلاً کسی کی عشری زمین میں دس من گندم پیدا ہو تو اسے اختیار ہے کہ چاہے اس میں سے ایک من گندم دیدے یا ایک من گندم کی قیمت دیدے۔

بندہ محمد رفیع عثمانی

مدرس دارالعلوم کراچی

۱۳ شعبان ۱۳۸۲ھ

زکوٰۃ و عشر آرڈیننس میں
اصلاحات کیلئے تجاویز

زکوٰۃ و عشر آرڈی ننس میں اصلاحات کے لئے تجاویز

سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے خزانہ کی ذیلی کمیٹی برائے زکوٰۃ و عشر کا ایک اجلاس ۷ فروری ۱۹۹۲ء (۱۲ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ) کو سینٹ کے کمیٹی روم (اسلام آباد) میں منعقد ہوا، کمیٹی کے چیرمین جناب پروفیسر خورشید احمد کی دعوت پر صدر دارالعلوم کراچی مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے بھی اس میں شرکت فرمائی اور مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں اور تمہید میں فرمایا کہ موجودہ نظام زکوٰۃ و عشر کی اصلاح اور اسے بہتر بنانے کیلئے پچھلے کئی سالہ تجربات کی روشنی میں تین امور کا بغور تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اور تینوں امور میں اصلاحات تجویز کرنی چاہئیں، وہ تین امور یہ ہیں:-

(۱) زکوٰۃ و عشر آرڈی ننس مجریہ ۱۹۸۰ء (جس میں ۱۹۸۳ء تک کی گئی ترمیمیں بھی شامل ہیں)

(۲) اس آرڈی ننس کے تحت بنائے گئے قوانین، ضابطے، قواعد، اور اس کے تحت اختیار کی گئی حکمت عملی، اور عملی پالیسیاں۔

(۳) اس نظام کو چلانے والی مشینری (رجال کار) کی اہلیت، دیانت، اور فرض شناسی۔

لیکن آج کی مجلس کا موضوع چونکہ صرف اول الذکر (زکوٰۃ و عشر آرڈی ننس) ہے، اسلئے اسکے متعلق تجاویز پیش کر رہا ہوں، تاہم آخر میں بطور ضمیمہ صرف دو تجویزیں (ایک) بھی عرض کروں گا جن کا تعلق امر ثانی یعنی آرڈی ننس کے تحت بنائے گئے، (یا بنائے جانے والے) قوانین، ضوابط اور قواعد اور حکمت عملی سے ہے، تاہم موخر الذکر دونوں موضوعات پر غور و خوض بھی کسی مستقل اجلاس میں کیا جانا چاہئے۔

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

تجویز نمبر ۱۔ کسی مسلم فقہی مکتب فکر کے لوگوں کو زکوٰۃ کی کوٹنی سے مستثنیٰ کرنا درست نہیں، لہذا پہلے باب دفعہ ۱ کی ذیلی دفعہ ۳، اور اسکی ذیلی شق (۳) الف) حذف کر دینی چاہئے۔

تجویز نمبر ۲۔ مستحق زکوٰۃ کی تعریف آرڈی ننس میں درج نہیں اس کا اضافہ ہونا چاہئے۔

تجویز نمبر ۳۔ دوسرے باب دفعہ ۳ کی ذیلی دفعہ (۱) اور اس تیسرے فقرہ شرطیہ میں مندرجہ ذیل طریقے سے ترمیم ضروری ہے۔

ذیلی دفعہ (۱) میں لفظ تاریخ تشخیص مالیت سے پہلے لفظ سال زکوٰۃ کے آغاز اور کا اضافہ کیا جائے اور لفظ اور پورے پچھلے سال زکوٰۃ کے دوران صاحب نصاب رہا ہو، کو حذف کر دیا جائے، کیونکہ جو شخص سال زکوٰۃ کے آغاز اور تاریخ تشخیص مالیت (سال زکوٰۃ کے اختتام) میں صاحب نصاب تھا، دوران سال اس کے پاس مالیت، نصاب سے کم رہ گئی (ختم نہیں ہوئی) تو ایسے شخص پر زکوٰۃ شرعاً فرض ہے۔

نیز ذیلی دفعہ (۱) کے تیسرے الگ کریں بفقرہ شرطیہ میں بھی اس کو شریعت کے مطابق کرنے کے لئے لفظ تاریخ تشخیص مالیت سے پہلے لفظ سال زکوٰۃ کے آغاز پر اور کا اضافہ کیا جائے، اور لفظ پورے پچھلے سال زکوٰۃ حذف کر دیا جائے۔

تجویز نمبر ۴۔ دوسرے باب کی دفعہ ۳، کے ذیلی دفعہ ۲ سے لفظ مندرجہ ذیل، کو حذف کرنا ضروری ہے، نیز اسی ذیلی دفعہ کی شق (الف) (ب) (ج) کو بھی حذف کر دیا جائے، تاکہ ہر قسم کے غابت شدہ قرضے جو کسی سے لئے گئے

ہوں زکوٰۃ کی کٹوتی سے مستثنیٰ ہو سکیں، البتہ تجارتی مقاصد کیلئے حاصل کئے گئے قرضے اگر زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہ کئے جائیں تو شرعاً اسکی گنجائش معلوم ہوتی ہے، نیز دفعہ ۳ کی ذیلی دفعہ ۳ کی شق (ب) سے لفظ پورے پچھلے سال کو لفظ پچھلے سال زکوٰۃ کے آغاز اور تاریخ تشخیص مالیت سے بدل دیا جائے، تاکہ تجویز نمبر ۳ سے مطابقت ہو سکے۔

تجویز نمبر ۵: پانچویں باب دفعہ ۱۲، ذیلی دفعہ (۲) (ج) کے بعد اس فقرہ شرطیہ کا اضافہ کیا جائے، مگر شرط یہ ہے کہ ہر صوبے سے ایک شخص اس طرح نامزد کیا جائے گا کہ سب صوبوں سے نامزد کردہ اشخاص کے مجموعے میں کم از کم ۲ حضرات دینی علوم کے ماہر ہوں۔

تجویز نمبر ۶: دفعہ ۸، کی شق (الف) میں لفظ غریب کے بعد لفظ افراد کی جگہ لفظ مسلمان لکھا جائے۔

تجویز نمبر ۷: پانچویں باب دفعہ ۱۶ کی ذیلی دفعہ ۳ کے پہلے فقرہ شرطیہ کے بعد مندرجہ ذیل فقرہ شرطیہ کا اضافہ کیا جائے، مزید شرط یہ ہے کہ ضلع زکوٰۃ کمیٹی میں غیر سرکاری ارکان میں کم از کم ۳ مستند علمائے دین ہوں گے۔

تجویز نمبر ۸: دفعہ ۱۹ الف، میں ہر جگہ لفظ ارکان کے بعد لفظ عہدیداران کا اضافہ کیا جائے تاکہ زکوٰۃ کونسلوں اور زکوٰۃ کمیٹیوں کے عہدیداران کا بھی مسلمان ہونا اس آرڈی نس کی رو سے لازمی ہو جائے۔

تجویز نمبر ۹: پورے آرڈی نس میں جہاں جہاں بھی لفظ بالغ مسلمان لکھا گیا ہے وہاں عاقل بالغ مسلمان لکھا جائے۔

کتبہ: محمد رفیع عثمانی
صدر دارالعلوم کراچی۔ کراچی

۱۲ شعبان ۱۴۱۲ھ
۷ فروری ۱۹۹۳ء

ضمیمہ تجاویز محمد رفیع عثمانی

بابت موجودہ نظام زکوٰۃ و عشر

تجویز نمبر ۱: مستحقین کو مالی امداد بہت کم بلکہ برائے نام دی جاتی ہے، اور طویل وقفوں سے دی جاتی ہے، اس طرح کسی بھی مستحق زکوٰۃ کی ضرورت پوری نہیں ہوتی نہ اس کی حاجت مندی کا ازالہ ہوتا ہے، جسکے باعث وہ بھیک مانگنے پر بھی بسا اوقات مجبور ہو جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گیارہ بارہ سال سے نافذ شدہ اس نظام زکوٰۃ کا کوئی خوشگوار اثر معاشرے پر مرتب نہیں ہوا، اور اس نظام کی کوئی افادیت عوام کے سامنے نہیں آسکی، اس طرح نظام زکوٰۃ بدنام بھی ہو رہا ہے، اور اس پر عوام کا اعتماد کمزور ہونے میں یہ ایک سبب بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔

لہذا میری تجویز ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہو کہ وہ شرعاً مستحق زکوٰۃ ہے، اسے (خاص طور سے جبکہ وہ یتیم، بیوہ، یا لپاچ ہو) پابندی سے ہر ماہ اتنی رقم زکوٰۃ فنڈ سے دی جائے جو اس کی اور اس کے زیر کفالت افراد کی ضرورتوں کو موجود مہنگائی کے دور میں بھی باعزت طریقے سے پورا کر سکے۔
تجویز نمبر ۲: اگر نظام زکوٰۃ کو صحیح اور موثر طریقے سے نافذ کر دیا جائے اور

زکوٰۃ فنڈ سے بے کس اور کمانے کے ناقابل افراد کی پوری کفالت کی جائے تو کسی مسلمان کو گداگری اور بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں رہے گی، لہذا جلد از جلد نظام زکوٰۃ کو مفید اور موثر بنا کر انسداد گداگری کے لئے بھی موثر نظام وضع کیا جائے، تاکہ پورے ملک میں مسلمان بھکاری نظر نہ آئے۔

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

دارالعلوم کراچی

۱۲ شعبان ۱۴۱۲ھ

۷ فروری ۱۹۹۲ء

مسائل صدقہ فطر

مسائل صدقۃ الفطر

بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس پر زکوٰۃ فرض نہیں اس پر صدقۃ فطر بھی واجب نہیں، حالانکہ بہت سے لوگوں پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی مگر صدقۃ فطر واجب ہوتا ہے، جیسا کہ کئی مسائل میں آگے معلوم ہوگا۔

(۱) جو مسلمان اتنا مالدار ہو کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہو، یا زکوٰۃ تو فرض نہ ہو لیکن اس کے پاس ضروری سامان سے زائد اتنا سامان ہو کہ اس کی قیمت ساڑھے (۵۲۱/۲) تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو تو اس پر صدقۃ فطر واجب ہے، چاہے وہ سامان تجارت کا ہو یا تجارت کا نہ ہو، (مثلاً گھریلو سامان ضرورت سے زائد ہو) اور چاہے اس پر پورا سال گذرا ہو یا نہ ہو گذرا ہو۔ (مراقی الفلاح)

(۲) کسی کے پاس اپنی رہائش کا بڑا قیمتی مکان ہے اور پہننے کی قیمتی کپڑے ہیں مگر ان میں سچا گوشت ٹھپہ نہیں نیز گھریلو سامان ہے جو استعمال میں آتا رہتا ہے مگر زیور اور روپے نہیں، کچھ سامان ضرورت سے زیادہ بھی ہے اور کچھ سچا گوشت ٹھپہ زیور اور روپے بھی ہیں، مگر ان کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے کم ہے تو ایسے شخص پر صدقۃ فطر واجب نہیں۔ (مراقی الفلاح)

(۳) کسی کے پاس زیور اور روپے نہیں نہ سامان تجارت ہے مگر کچھ اور سامان ضرورت سے زیادہ ہے جس کی مجموعی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہے تو ایسے شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں مگر صدقۃ فطر واجب

ہے۔ (مراقی الفلاح)

(۴) کسی کے پاس دو مکان ہیں، ایک میں خود رہتا ہے اور ایک خالی پڑا ہے یا کرایہ پر دیا ہوا ہے تو شرعاً یہ دوسرا مکان ضرورت سے زائد ہے اگر اس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو تو اس شخص پر صدقۃ فطر واجب ہے، البتہ اگر اسی مکان کے کرایہ پر اس کا گزارہ ہو تو یہ مکان، بھی ضروری سامان میں داخل ہو جائے گا اور اس پر صدقۃ فطر واجب نہ ہوگا۔ (فتاویٰ قاضی خان)

(۵) کسی کے پاس ضروری سامان سے زائد مال اور سامان ہے مگر وہ قرض دار بھی ہے تو قرضہ منہا کر کے دیکھیں کیا بچتا ہے؟ اگر ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر یا زائد بچتا ہو تو صدقۃ فطر واجب ہے، اور اس سے کم بچے تو واجب نہیں۔ (در مختار)

(۶) عید الفطر کے دن صبح صادق کے وقت یہ صدقہ واجب ہوتا ہے، لہذا اگر فجر کا وقت آنے سے پہلے ہی کسی کا انتقال ہو گیا تو اس پر صدقۃ فطر واجب نہیں، اس کے مال میں سے نہ دیا جائے، اور جو بچہ عید کے دن فجر کے وقت سے پہلے پیدا ہوا اس کی طرف سے صدقۃ فطر دینا واجب ہے، اور جو بچہ فجر کا وقت شروع ہونے کے بعد پیدا ہوا اس کی طرف سے صدقۃ فطر واجب نہیں۔ (عالمگیری)

(۷) مرد پر صدقہ اپنی طرف سے اور اپنی چھوٹی (نابالغ) اولاد کی طرف سے ادا کرنا واجب ہے، بالغ اولاد اور بیوی کی طرف سے ادا کرنا واجب نہیں، اگر بیوی یا بالغ اولاد کے پاس اتنا مال ہو کہ جس سے صدقۃ فطر واجب ہو تا ہے تو وہ اپنا اپنا صدقۃ فطر خود ادا کریں، البتہ اگر مرد اپنی بیوی اور نابالغ اولاد کی طرف سے

(۱۴) اگر گندم اور جو کے علاوہ کوئی اور اناج دینا ہو، مثلاً چنا، جوار، یا چاول وغیرہ تو اتنا دیں کہ اس کی قیمت اتنے خالص گندم یا اتنے خالص جو کی برابر ہو جائے جتنا اوپر بیان ہوا۔ (در مختار)

(۱۵) اگر گندم اور جو نہیں دیئے بلکہ اتنے خالص گندم یا اتنے خالص جو کی قیمت دیدی تو یہ سب سے بہتر ہے (عالمگیری) قیمت چونکہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، لہذا ہر سال ادا کرنے کے وقت بازار سے خالص گندم کی قیمت معلوم کر کے عمل کیا جائے آج کل راشن کا آنا چونکہ خالص گندم کا نہیں ہوتا لہذا اس کی قیمت کا اعتبار نہیں۔

(۱۶) اوپر جو مقدار بیان کی گئی یہ ایک شخص کا صدقہ فطر ہے، جس مرد پر صدقہ فطر واجب ہو اگر اس کی نابالغ اولاد بھی ہے تو ہر بچہ کی طرف سے بھی اتنا ہی صدقہ فطر دینا واجب ہے۔

(۱۷) ایک آدمی کا صدقہ فطر ایک ہی فقیر کو دیں یا تھوڑا تھوڑا کر کے کئی فقیروں کو دیدیں دونوں طرح جائز ہے۔ (در مختار)

(۱۸) اگر کئی آدمیوں کا صدقہ فطر ایک ہی فقیر کو دیدیا تو یہ بھی درست ہے۔ (در مختار)

(۱۹) صدقہ فطر ان ہی لوگوں کو دیا جاسکتا ہے جو زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔

واللہ اعلم

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

صدر دارالعلوم کراچی۔ کراچی ۱۴

بھی ان کو بتا کر ادا کر دے تو یہ بھی درست ہے، ان کی طرف سے اتنا ہو جائیگا۔ (ہدایہ)

(۸) اگر چھوٹے (نابالغ) بچے کی ملکیت میں اتنا مال ہو جتنے کے ہونے سے صدقہ فطر واجب ہوتا ہے، مثلاً اس کے کسی رشتہ دار کا انتقال ہو اس کی میراث میں اس بچہ کو حصہ ملا، یا کسی اور طرح سے بچے کو مال مل گیا تو باپ اس بچہ کا صدقہ فطر اس کے مال میں سے ادا کرے اپنے مال میں سے دینا ضروری نہیں۔ (فاضل خان)

(۹) جس نے کسی وجہ سے روزے نہیں رکھے اس پر بھی صدقہ واجب ہے اور جس نے روزے رکھے اس پر بھی واجب ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ (عالمگیری)

(۱۰) بہتر یہ ہے کہ عید الفطر کی نماز کو جانے سے پہلے ہی یہ صدقہ ادا کر دیا جائے اگر پہلے نہ دیا تو بعد میں ادا کر دیں۔ (عالمگیری)

(۱۱) کسی نے عید کے دن سے پہلے ہی رمضان میں صدقہ فطر دیدیا تب بھی ادا ہو گیا اب دوبارہ دینا واجب نہیں۔ (در مختار)

(۱۲) اگر کسی نے عید کے دن صدقہ فطر نہ دیا تو معاف نہیں ہوا، اب کسی دن دیدینا چاہئے۔ (ہدایہ)

(۱۳) صدقہ فطر میں اگر گندم دیں یا خالص گندم کا آٹا دیں تو ایک شخص کی طرف سے ایک سیر ساڑھے بارہ چھٹانک دیں، بلکہ احتیاطاً پورے دو کلو یا کچھ زیادہ دیدینا چاہئے کیونکہ زیادہ دینے میں کچھ حرج نہیں بلکہ بہتر ہے، اور اگر جو یا خالص جو کا آٹا دینا ہو تو اس کا دو گنا دینا واجب ہے۔ (ہدایہ)

جرمنی میں رویت ہلال کا مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جرمنی میں رویت ہلال کا مسئلہ

محترم مفتی صاحبان دارالعلوم کراچی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
براہ کرم درج ذیل مسئلہ کا حل قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کریں:

ہم یہاں جرمنی میں مقیم ہیں اور ہر سال ہمیں اس مسئلہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

جرمنی میں مختلف اقوام رہائش پذیر ہیں جن میں خاص طور پر ترکی، عربی اور دوسری اقوام جن میں پاکستانی بھی شامل ہیں اسلامی تاریخیں چاند کے حساب سے یعنی رویت کے مطابق طے کی جانی چاہئے۔

جرمنی میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ چاند موسم ابرآلود ہونے کی وجہ سے کم ہی نظر آتا ہے خاص طور پر پہلی تاریخوں میں چاند کا نظر آنا محال ہے۔

اب یہاں ہوتا یہ ہے کہ ترکی احباب کا اپنا ایک کیلنڈر ہوتا ہے جس میں سارے سال کی تاریخیں پہلے سے طے ہوتی ہیں یعنی اسلامی مہینے پہلے سے طے ہوتے ہیں کہ کب شروع ہوں گے۔

عربی احباب مکہ کے کیلنڈر کے حساب سے چلتے ہیں یعنی جب عید مکہ مکرمہ میں ہوگی تو یہاں بھی عید ہوگی۔

پاکستانی احباب یہاں محکمہ موسمیات اور انگلینڈ والوں سے پوچھ کر چاند کی تاریخیں طے کرتی ہیں واضح رہے کہ انگلینڈ میں بھی موسم عام طور پر ابرآلود رہتا ہے۔ سوائے ترکی کے جرمنی کے پڑوس میں کوئی مسلمان ملک نہیں ہے۔

واضح رہے کہ محکمہ موسمیات والوں کے کیلنڈر کے حساب سے 23.02.2001 کو چاند صرف دو منٹ کیلئے نظر آنا چاہئے تھا تو ہماری پاکستانی مسجد نے فیصلہ کیا کہ چونکہ عام آنکھ اس چاند کو نہیں دیکھ سکتی اس لئے چاند 24.02.2001 کا معتبر ہے۔

جرمنی کا محکمہ موسمیات اگلے چند سال کا چاند کا حساب پہلے سے ہی دے دیتا ہے۔

(1) اب یہاں تمام دوسرے احباب تو عید 05.03.2001 کو منا رہے ہیں اور پاکستانی احباب (فرینکفرٹ) 06.03.2001 کو عید منا رہے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی (عربی، ترکی اور پاکستانی) جرمنی میں رویت کو ملحوظ نظر نہیں رکھا تو ایک عام مسلمان کا کیا طریقہ کار ہونا چاہئے کہ قرآن اور سنت کے احکام صحیح طرح پورے ہو جائیں؟

(2) کیا ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ایک دن انتظار کرے جبکہ اس کے شہر کی واحد ترکی مسجد میں نماز عید 05.02.2001 کو پڑھی جا رہی ہو اور اس شہر کے سارے مسلمان جو کہ 99% ترکی ہیں اسی دن اس عید کو منا رہے ہوں اور وہ ایک مسلمان فرینکفرٹ کی پاکستانی مسجد کے ساتھ عید منانے چونکہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہی عید مناتا ہے جبکہ فرینکفرٹ اس کے شہر سے تقریباً 48 میل دور ہے کیا یہ صحیح ہے؟

(3) کیا امام القریٰ کے حساب سے جرمنی میں عید کرنا صحیح ہے؟

براہ کرم جلد از جلد جوابی فیکس سے نوازیں تاکہ ہم صحیح طریقے سے اپنا دینی فریضہ ادا کر سکیں

والسلام علیکم

دعاؤں کا طالب

محمد اشرف قریشی جرمنی

الجواب

۱- اصل میں تو یوں ہونا چاہئے کہ جرمنی میں کوئی ایک مرکزی رویت ہلال کمیٹی قائم ہو، جو علماء دین پر مشتمل ہو اور کوشش یہ کی جائے کہ اس میں عرب، ترک اور پاکستانی و ہندوستانی علماء کرام شامل ہوں، پھر یہ کمیٹی چاند دیکھنے کے لئے ملک کے مختلف علاقوں میں جہاں چاند نظر آنے کا زیادہ امکان ہو، ذیلی کمیٹیاں بنادے۔ ہر کمیٹی میں بھی کوشش کی جائے کہ کم از کم ایک دو عالم دین شامل ہوں، اور یہ کمیٹیاں شرعی ضابطہ شہادت کے مطابق گواہیاں سن کر رویت ہلال کا پورے ملک کے لئے فیصلہ کر دیں، اور جرمنی کے تمام مسلمان اس فیصلے کے مطابق عمل کریں، ان کمیٹیوں کی رہنمائی کے لئے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ”رویت ہلال“ جو اردو میں ہے ان کے سامنے ہونا چاہئے، نیز مفتی اعظم موصوف کی کتاب ”جواہر الفقہ“ جلد نمبر ۱ کے صفحہ ۳۹۵ سے لیکر ۴۰۳ تک کل ۹ صفحات بھی ان کے سامنے ہونے چاہئیں، کیونکہ یہ ۹ صفحات مذکورہ بالا رسالے یعنی ”رویت ہلال“ کا خلاصہ ہیں، اور ان میں طریقہ کار کو کچھ مزید آسان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲- لیکن جب تک ایسا نہیں ہوتا یا پورے جرمنی میں کہیں بھی چاند دیکھنا موسم

کے باعث عموماً ممکن نہیں ہوتا تو یہ بھی جائز ہے کہ جس قریب ترین ملک میں رویت ہلال کا فیصلہ شرعی شہادتوں اور شرعی قاعدے کے مطابق کرنے کا انتظام موجود ہے، وہاں رویت ہلال کے بارے میں جو فیصلہ ہو، اس پر جرمنی کے مسلمان بھی عمل کر لیں۔

۳- مگر سوال میں جو موجودہ صورتحال درج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک مسلمان اپنے الگ کیلنڈر پر عمل کرتے ہیں، یہ کیلنڈر رکس بنیاد پر بنایا گیا ہے، یہ تفصیل سوال میں درج نہیں، لہذا اس کے بارے میں تو کچھ کہنا مشکل ہے، اور سعودی عرب کے اعلان کے مطابق جو حضرات عمل کرتے ہیں اس کی شرعاً گنجائش ہے، کیونکہ سعودی حکومت کا کہنا یہی ہے کہ ان کے یہاں رویت ہلال کا فیصلہ خالص شرعی ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے، اور رویت کے مطابق ہوتا ہے، فلکی حسابات کی بنیاد پر نہیں، اگرچہ سعودی حکومت کے اس اعلان کی صداقت پر بہت سے لوگوں کو اطمینان نہیں، لیکن اس اعلان کی تکذیب کی بھی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں، بہت سے حضرات کو سعودی عرب کے اعلان پر اس وجہ سے اطمینان نہیں ہوتا کہ ان کا کہنا ہے کہ بسا اوقات سعودی حکومت کا اعلان فلکی حسابات کے خلاف ہوا ہے یعنی رویت ہلال کا فیصلہ ایسے وقت کر دیا گیا، جب کہ سعودی عرب میں فلکی حسابات کی رو سے رویت ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن شریعت میں چونکہ رویت کا مدار شرعی ضابطہ شہادت پر ہے اور فلکی حسابات پر مدار نہیں ہے اس لئے اہل جرمنی اگر سعودی عرب کے فیصلے پر عمل کر لیں تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

سوال میں کہا گیا ہے کہ پاکستانی مسلمان محکمہ موسمیات اور برطانیہ کے مسلمانوں سے پوچھ کر عمل کرتے ہیں، تو جہاں تک محکمہ موسمیات کا معاملہ ہے تو ان کا فیصلہ تو شرعاً معتبر نہیں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور برطانیہ کے مسلمانوں میں

خود اس مسئلے میں اختلاف ہے، ہمیں معلوم ہے کہ وہاں علماء دین اور عوام کی اکثریت سعودی اعلان پر عمل کرتی ہے، اور کچھ حضرات مراکش کے اعلان پر۔

معلوم نہیں جرمنی کے حضرات ان دو میں سے کس سے پوچھ کر عمل کرتے ہیں، تاہم اہل جرمنی کے لئے اس کی بھی گنجائش ہے کہ وہ مراکش کے اعلان پر عمل کر لیں، کیونکہ برطانیہ کے بعض علماء کرام نے مجھے بتایا ہے کہ مراکش میں رویت ہلال کا فیصلہ شرعی ضابطہ شہادت کے مطابق کیا جاتا ہے۔

۴۔ اور جہاں تک پاکستانی مسجد کے اعلان کا تعلق ہے، وہ بظاہر اس پر مبنی ہے کہ ۲۳ فروری کو فرینکفرٹ میں ذیقعدہ کی ۲۹ تاریخ تھی، اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو ان کا اعلان بھی شریعت کے خلاف نہیں، کیونکہ شریعت کا قانون یہ ہے جس کی صراحت آنحضرت ﷺ کی حدیث صحیح میں بھی موجود ہے، کہ جب ۲۹ کا چاند نظر نہ آئے تو مہینے کے تیس دن پورے کئے جائیں، یعنی چاند میں تاریخ کا سمجھا جائے، شریعت کے اس قانون کا تقاضا تو یہ تھا کہ پاکستانی مسجد کے اعلان پر ہی عمل واجب ہوتا، اور اس کے خلاف جائز نہ ہوتا لیکن سوال میں جرمنی کے مسلمانوں کا جو مختلف طرز عمل ذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہے کہ جرمنی میں عمل جرمنی کی رویت پر نہیں ہوتا بلکہ باہر کے کسی ملک کی بیروی میں ہوتا ہے، یا کچھ لوگ محکمہ موسمیات سے پوچھ کر عمل کرتے ہیں، تو اب ہمیں یہ معلوم نہیں کہ فرینکفرٹ میں ۲۳ تاریخ کو ذیقعدہ کی ۲۹ تاریخ کس بنیاد پر تھی، بظاہر وہ بھی مذکورہ بالا تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر مبنی ہوگی، اور وہ مختلف فیہ ہے، لہذا فرینکفرٹ کی پاکستانی مسجد کے فیصلے کو بھی ایسا لازمی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس سے مختلف متبادل طریقے پر عمل کی بالخصوص دوسرے شہر میں کوئی گنجائش نہ ہو۔

تاہم مسلمانان جرمنی کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ آئندہ کے لئے علماء

کرام کی رہنمائی میں شرعی ضابطہ کے مطابق اور مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں رویت ہلال کا ایسا طریقہ طے کر لیں کہ پورے ملک کے مسلمان ایک ہی تاریخ میں عید کر سکیں۔

خلاصہ یہ کہ جن صاحب کے بارے میں یہ سوال ہے، ان کے لئے گنجائش ہے کہ وہ ۵ مارچ ۲۰۱۰ء کو عید الاضحیٰ کر لیں، جیسا کہ ان کے شہر کے ترکی مسلمان کر رہے ہیں، ترکی مسلمانوں نے یہ فیصلہ کس بناء پر کیا ہے، یہ تو ہمیں سوال سے معلوم نہیں ہوا، لیکن چونکہ سعودی عرب میں عید الاضحیٰ ۵ مارچ ہی کو ہو رہی ہے تو سعودی اعلان کی پیروی میں اہل جرمنی کو اس پر عمل کر سنے کی پوری گنجائش ہے۔ واللہ اعلم

کتبہ

محمد رفیع عثمانی

مفتی جامعہ ارا العلوم کراچی

۶ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی

سحری کے سلسلہ میں
صبح صادق و کاذب کی تحقیق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سحری کے سلسلہ میں صبح صادق و کاذب کی تحقیق

لیسٹر انگلینڈ سے صبح صادق کے بارے میں چند سوالات حضرت مدظلہ کی خدمت اقدس میں بذریعہ فیکس موصول ہوئے جن کے جوابات حضرت مدظلہ نے فقہ سائنہ انداز میں املاء کروا کر اس اختلافی مسئلہ کو بڑے خوبصورت انداز میں حل فرمایا۔

محترم و مکرم حضرت اقدس مفتی اعظم محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کرے حضرت کے مزاج گرامی بخیر ہو۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو صحت عافیت خدمت دین اور فیوض عامہ و تامہ کے ساتھ طویل عمر نصیب فرمائیں، آمین حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد ذوالحجہ ۱۴۱۱ھ (اگست ۱۹۹۱ء) میں بندہ اپنے وطن شہر لیسٹر میں مستقل قیام پذیر ہوا، مسجد النور کی دینی ذمہ داری شوال ۱۴۱۲ھ سے بندہ کے سر پر ڈالی گئی جب کہ مسجد کا انتظام ایک کمیٹی سنبھال رہی تھی۔ شعبان ۱۴۱۶ھ (جنوری ۱۹۹۶ء) سے مسجد کے کل انتظام کا بوجھ بندہ پر آگیا جو تائید و تہ ہے بحمد اللہ تعالیٰ و بتوفیقہ۔ میرے اکابر کی جوتیوں کی برکت سے اس عرصہ نو سال میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ کوئی کام خلاف شرع نہ ہو اور اپنے اکابر سے مشورہ کرنے اور ان کی ارشادات پر عمل کرنے کا

اجتماع رہا یہ محض اللہ کا لطف و کرم اور فضل و انعام ہے اللہم لک الحمد و لک الشکر۔ جہانگیر اوقات نماز کا تعلق ہے بندہ کی لیسٹر آمد سے قبل ہی سے مساجد کے مابین اس سلسلہ میں اختلاف شروع ہو چکا تھا اپنے مسلک کی کل سات مساجد میں سے جامع مسجد النور اور مسجد الامام البخاری کا عمل ایک رہا ہے جب کہ باقی پانچ میں سے چار ایک وقت پر متحد ہیں اور لیسٹر کے تبلیغی مرکز کی مسجد کا معاملہ توقف کار رہا ہے بندہ نے مسجد النور کی ذمہ داری سنبھالتے ہی صبح صادق کے اس اختلاف پر غور کرنا شروع کیا محض اس نیت سے کہ مسجد النور کا وقت صحیح ہے کہ نہیں اس سلسلہ میں مسجد النور کے سابق امام ابراہیم تارا پوری صاحب مدظلہم (جو ایک ذی استعداد عالم ہیں) اور حضرت مولانا محمد گرام صاحب مدظلہم (جن کا تعلق مسجد الفلاح سے ہیں اور لیسٹر کے پرانے معتبر علماء میں سے ہیں) سے فرداً فرداً گفتگو ہوئی ان حضرات سے معلوم ہوا کہ مسجد النور وغیرہ مساجد میں صبح صادق کے وقت کا تعین برطانیہ کے علماء مرکزی جمعیت العلماء اور حزب العلماء یو کے کے فیصلہ کے مطابق ہے اور ان تینوں جماعتوں کا فیصلہ چند معتبر علماء کے مشاہدہ پر مبنی ہے، اس مشاہدہ کے بعد جس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا اس میں علماء اور مفتیوں کی بڑی تعداد موجود تھی اور اس فیصلہ کی بنیاد پر سواد اعظم کی اتباع^(۱) میں لیسٹر کی تمام مساجد کے ائمہ نے متفقہ طور پر اسی مشاہدہ پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا بعد میں جامع مسجد نے اور اس کی اتباع میں مسجد امام بخاری نے اس سے ہٹ کر الگ ٹائم ٹیبل چھپوایا (جو ۱۸ ڈگری کے حساب سے تھا)

(۱) یہ مشاہدہ کا وقت ۱۲ ڈگری پر نہیں ہے بلکہ طلوع شمس سے ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ پہلے صبح صادق کا وقت ہے مسجد النور میں ہمیشہ سے صبح صادق سے بھی دس منٹ پہلے سحری ختم کرنے کا معمول ہے اور نقشہ پر ہی وقت پاجاتا ہے جو کبھی ۱۵ ڈگری پر اور کبھی اس کے قریب ہو جاتا ہے۔

۱- اس وقت بھی اور اب بھی انگلینڈ کی اکثر مساجد کا عمل اسی مشاہدہ پر ہے جو تقریباً ۱۳ اور ۱۵ ڈگری کے آگے پیچھے کم و بیش رہتا ہے۔

بندہ کو اس تفصیل سے مسجد النور کے وقت صبح صادق کے بارے میں اطمینان ہو گیا اور مزید تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی اگرچہ دل میں بار بار یہ تقاضا اٹھتا رہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر لیسٹر کی تمام مساجد سحری کے وقت پر اتفاق کر لیتے اور کئی ذمہ دار حضرات سے اس سلسلہ میں سرسری گفتگو بھی ہوئی لیکن یہاں کے حالات کے پیش نظر اچھے نتیجہ کی امید نہیں ہوئی بہر حال مسجد النور کے مروجہ اوقات صبح صادق پر عمل اس یقین کے ساتھ رہا کہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے اور جانبین حق پر ہیں، حضرت مولانا یعقوب قاسمی صاحب مدظلہم نے بھی گذشتہ سال ایک گرامی نامہ میں اس کی طرف متوجہ کیا لیکن اسی یقین کی وجہ سے توجہ کی توفیق نہیں ہوئی خصوصاً جب کہ بندہ کے علاقہ میں تمام مساجد کا عمل مشاہدہ پر متحد تھا۔ احباب کے تقاضوں پر بیرون ممالک کے اسفار تھے۔ اسفار سے واپسی پر حضرت والا کا گرامی نامہ پڑھا جس میں حضرت والا نے وقت صبح صادق کو درست کر کے ۱۸ ڈگری پر کرنے کو ضروری بتلایا ہے بندہ کے لئے حضرت کا اشارہ بھی کافی تھا چنانچہ حضرت کی بات پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے تاکہ حق پر عمل ہو اور یہ جذبہ قبول حق بھی اللہ کی توفیق اور آپ بزرگوں کی جوتیوں کی برکت ہی سے حاصل ہوا ہے ورنہ اس حقیر کی کیا ہمت اور حیثیت؟ اب اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بندہ کو حضرت کی رہنمائی اور تعاون کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کو افتراق و انتشار سے بچایا جاسکے۔

سوال نمبر ۱- علم ہدیت کے مطابق صبح صادق اس وقت ہو جاتا ہے جب آفتاب طلوع سے پہلے ۱۸ درجے نیچے ہوتا ہے کیا یہ اصول علماء کے یہاں متفقہ

ہے؟ اگر نہیں تو اختلاف کرنے والے حضرات کتنے ہیں؟ اور کیا یہ اختلاف ہمیشہ سے رہا ہے؟

سوال نمبر ۲- سورج کے ۱۸ درجے زیر افق ہونے پر صبح صادق کا تحقیق ہو جاتا ہے اگر ۱۵ درجے پہنچنے تک کوئی کھانے پینے میں مشغول رہا تو کیا حکم ہے؟ اور ۱۵ درجے پر آفتاب کے پہنچنے کے بعد کوئی کھانے پینے میں مشغول رہا تو کیا حکم ہے۔

سوال نمبر ۳- جو حضرات مشاہدہ کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا مشاہدہ کی بشرط کیا حیثیت ہوگی کیا اسے غلطی پر محمول کیا جائے گا؟

سوال نمبر ۴- مذکورہ تفصیل کے بعد یہ بتلایا جائے کہ جن حضرات نے اسب تک مشاہدہ کو بنیاد بنا کر تینوں جمعیتوں کے فیصلے کے مطابق اس کو حق سمجھتے ہوئے روزے رکھے ان کے روزوں کا کیا حکم ہے؟ ان کی قضاء لازم ہوگی یا یہ لوگ معذور سمجھے جائیں گے بندہ خود لائل کی ضرورت نہیں حضرت والا کا اشارہ بھی کافی ہے اور حق کے ظاہر ہونے کے بعد خالق کی رضاء کے لئے ان شاء اللہ سب کچھ کرنے کو تیار ہے لیکن بعض دوسرے مساجد کے ذمہ دار حضرات سے گفتگو کرنے سے بندہ کو یہ قوی امید ہو گئی ہے کہ اگر دارالعلوم کراچی سے حضرت والا اور حضرت مفتی محمد اتقی صاحب کی توفیقات کے ساتھ ان چند سوالوں کا جواب صراحت کے ساتھ مل جائے تو ان شاء اللہ لیسٹر کے عام مسلمانوں کا وقت صبح صادق پر اتفاق ہو جائے گا، بندہ کمزور ہے لہذا سعی بھی کمزور لیکن توفیقہ تعالیٰ حضرت والا کی توجہات سے انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

بندہ آپ کو زحمت ضرور دے رہا ہے لیکن رمضان المبارک کی آمد کی بالکل تیاری ہے اور نقشہ سحر و افطار چھپنے سے پہلے اگر مساجد کے ذمہ دار حضرات کے

سامنے یہ بات واضح ہو جائے تو بہت بہتر ہو گا ورنہ الگ الگ اوقات کے نقشہ چھیننے کے بعد مسئلہ ضد کا ہو سکتا ہے اور بعد میں دشواریاں ہو گئی، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

سائل: مولانا محمد سلیم دھورات انگلینڈ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب حامداً ومصلیاً ومسلماً

پہلے بطور تمہید دو باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں کہ سحری یا طلوع فجر جیسے مسائل میں شریعت نے دار و مدار حساب فلکی پر نہیں رکھا بلکہ مشاہدہ پر رکھا ہے، جیسا کہ نص قرآنی: کُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (سورۃ بقرہ آیت ۱۸۶) اس پر دل ہے، اور قابل اعتماد خبر یا شہادت اور تحریری پر مبنی غالب رائے کو مشاہدہ کے قائم مقام قرار دیا ہے کہ ”ظن غالب“ جو شریعت میں حجت ہے ان سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ (کما فی العبارات الآتیۃ)

دوسری بات یہ ہے کہ خود مشاہدہ بھی موسم، مقام، اور زمانے کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد سوالات کا جواب یہ ہے کہ ماہرین ہجرت کے درمیان اس میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ صبح صادق کے وقت آفتاب اٹھارہ درجہ زیر افق ہوتا ہے یا سترہ درجہ یا پندرہ درجہ، پندرہ درجہ سے کم کا کوئی قول ہمیں نہیں ملا، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں تقسیم ہند سے بہت پہلے سے لیکر اب تک جن

نقشوں پر عمل چلا آ رہا ہے، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اٹھارہ درجہ زیر افق کے مطابق ہیں۔

ہمارے استاد محترم حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم کی تحقیق یہ ہے کہ صبح صادق کے وقت آفتاب پندرہ درجہ زیر افق ہوتا ہے، لیکن اس تحقیق کو ہمارے بزرگوں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور شیخ الحدیث حضرت مولانا علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے اور جمہور علماء بر صغیر نے اختیار نہیں کیا اور پرانے نقشوں پر عمل کو برقرار رکھا، ان دونوں بزرگوں کی تحریروں کی فوٹوں کا پی منسلک کی جا رہی ہے، تفصیلی وجہ اس سے معلوم ہو جائے گی۔ دارالعلوم کراچی کی طرف سے جو نقشہ اوقات نماز اور نقشہ اوقات سحر و افطار شائع ہوتا ہے وہ بھی انہی پرانے نقشوں کے مطابق ہے، اور ہماری طرف سے لوگوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ سحری تو وہ ان نقشوں میں دس گئے وقت پر ختم کر دیں، لیکن اذان فجر دس بارہ منٹ بعد دیں اور نماز اس کے بھی کم از کم دس منٹ بعد پڑھیں تاکہ روزے میں بھی احتیاط پر عمل ہو سکے اور نماز فجر میں بھی۔

سوال میں کہا گیا ہے کہ برطانیہ کی اکثر مساجد میں جن نقشوں پر عمل ہو رہا ہے ان میں صبح صادق اور طلوع آفتاب کے درمیان ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کا فرق رکھا گیا ہے اور یہ فرق برطانیہ کے چند معتبر علماء کے مشاہدے پر مبنی ہے اور اسی کی بنیاد پر وہاں کے علماء کی تینوں جماعتوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا۔

اس صورتحال سے متعلق جواب یہ ہے کہ برطانیہ جیسے غیر معتدل موسم رکھنے والے علاقے میں ظاہر یہی ہے کہ سال بھر کے سب دنوں کا مشاہدہ تو نہ

عادتہ ممکن ہے اور نہ کیا جائے گا ہوگا، ظاہر یہی ہے کہ چند روز مشاہدہ کر کے جب ان میں فرق صبح صادق اور طلوع آفتاب کے درمیان ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کا پایا گیا تو انہی پر بقیہ ایام کو قیاس کیا گیا ہوگا۔ تو جن تاریخوں میں فرق ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کا مشاہدہ کیا گیا ان تاریخوں میں اس فرق پر عمل کرنے میں تو کوئی اشکال نہیں۔ اور یہ عمل شرعاً بالکل درست ہو گیا، اور بقیہ ایام جن کا وقت قیاس سے طے کیا گیا ان میں اس فرق کے مطابق عمل کرنا بھی شرعاً اس لحاظ سے غلط نہ رہا کہ برطانیہ جیسے علاقے میں ان سب ایام کا مشاہدہ ممکن نہ تھا، اور جب مشاہدہ ممکن نہ ہو تو شریعت نے ”ظن غالب“ کو معتبر مانا ہے۔ لہذا جب ان حضرات کا ”ظن غالب“ ان ایام کے بارے میں بھی ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کے فرق کا ہوا تو اس ”ظن غالب“ پر عمل کرنا ان کے لئے بھی جائز ہو گیا اور ان عوام کے لئے بھی جنہوں نے ان کے فتوے پر اعتماد کیا، بلکہ ان کے لئے بھی جائز ہو گیا جن کو اس فیصلہ کی صحت میں شک رہا، کیونکہ فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ جس شخص کو شک ہو کہ صبح صادق ہوئی ہے یا نہیں، تو اسے چاہئے کہ کھانا پینا چھوڑ دے، لیکن اگر وہ اس شک کے دوران کھاتا پیتا رہا تو روزہ اس کا پورا ہو جائے گا، کیونکہ رات کا وجود پہلے سے بالیقین ثابت تھا، یہ یقین شک سے زائل نہیں ہوگا۔

(ملاحظہ ہوں آنے والی فقہی عبارات)

لہذا اس فیصلہ کے مطابق جن لوگوں نے اب تک عمل کیا تو ”ظاہر الروایۃ“ (جسے فقہانے ”اصح“ فرمایا ہے) کے مطابق ان پر ان روزوں کی قضاء لازم نہیں ہے، اگرچہ بعد میں ”ظن غالب“ اس بات کا ہو جائے کہ ان کے کھانے پینے کے وقت طلوع فجر ہو چکا تھا۔

لیکن چونکہ یہ بات تجربے، مشاہدے، اور حسابات سے ثابت ہے کہ صبح صادق اور طلوع آفتاب کا درمیانی فرق سال بھر یکساں نہیں رہتا، بلکہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ خصوصاً برطانیہ جیسے غیر معتدل علاقے میں تو یہ فرق اور بھی زیادہ کم و بیش ہوتا ہے، چنانچہ بعض مہینوں میں یہ فرق دو گھنٹے سے بھی زیادہ کا ہوتا ہے، لہذا آئندہ پورے سال کے لئے ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کے فرق کو بطور اصول کے استعمال کرنا درست نہ ہوگا، کیونکہ ظن غالب اس کے خلاف حاصل ہو چکا ہے۔

(۱) وفي الهداية:

والمستحب تأخيرہ لقوله عليه الصلوة والسلام: ثلاث من اخلاق المرسلين تعجيل الافطار وتأخير السحور والسواك الا انه اذا شك في الفجر ومعناه تساوى الظنين الافضل أن يدع الاكل تحزراً عن المحرم ولا يجب عليه ذلك ولو اكل فصومه تام لأن الاصل هو الليل وعن ابى حنيفة رحمه الله تعالى اذا كان في موضع لا يستبين الفجر أو كانت الليل مقمرة او متغيمه أو كان ببصره علة وهو يشك لا يأكل ولو اكل فقد أساء لقوله عليه الصلوة والسلام: دع ما يريك إلى مالا يريك وان كان اكبر رأيه انه اكل والفجر طالع فعليه قضاؤه عملاً بغالب الراي وفيه الاحتياط وعلى ظاهر الرواية لا قضاء عليه لان اليقين لا يزال الا بمثله ولو ظهر ان الفجر طالع لا كفارة عليه لانه بنى الامر على الاصل فلا يتحقق العمدية.

وفي الفتح: قوله (على ظاهر الرواية لا قضاء عليه) لان اليقين لا يزال بالشك والليل اصل ثابت بيقين فلا ينتقل عنه الا بيقين وصححه في الايضاح.

وفي العناية: قوله (على ظاهر الرواية لا قضاء عليه) هو الصحيح لان الليل هو الاصل فلا ينتقل عنه الا بيقين واكبر رايه ليس كذلك (ص ٢٩٢ ج ٢)

(٢) وفي الهندية: ووقته من حين يطلع الفجر الثاني وهو المستطير المنتشر في الأفق الى غروب الشمس وقد اختلف في ان العبرة لاوّل طلوع الفجر الثاني او لاستطارته وانتشاره فيه قال شمس الأئمة الحلواني: القول الاول احوط والثاني اوسع هكذا في المحيط. واليه مال اكثر العلماء كذا في خزانة الفتاوى في كتاب الصلوة.

(ص ١٩٤ ج ١)

(٣) وفي اعلاء السنن: قال رسول الله ﷺ: لا يغرنكم من سحوركم اذان بلال ولا يياض الافق المستطيل هكذا حتى يستطير هكذا وحكاه حماد بيديه قال: يعني معترضاً رواه مسلم. (ص ١١٢ ج ٢)

قلت: والنص على الحكم على التبيين ولا يكون الا بالانتشار ولا يطلع على نفس طلوع الفجر الا واحد من المنين والخرج مدفوع بالنص فالقوى ما مال اليه اكثر

العلماء وان كان الاحوط الاول (اعلاء السنن ص ١١٣ ج ٢)

(٤) وفي التتار خانية: فان كان في موضع لا يرى طلوع الفجر او يرى الا ان السماء كانت مقمرة أو متغيمّة فان انضم الى الشك علامة اخرى تدل على طلوع الفجر من حيث الظاهر بان كان له ورد يوافق فراغه طلوع الفجر ففرغ منها وشك في طلوع الفجر أو كان يرى نجماً اذا اخذ مكاناً من السماء يوافق ذلك طلوع الفجر فاذا انضم الى الشك مثل هذه العلامة يدع الاكل والشرب ويكون مسيئاً اذا اكل او شرب ويكون عليه القضاء اذا كان اكبر رايه ان الفجر طالع هكذا ذكر شيخ الإسلام وذكر في القدوري في هذا الفصل روايتان وقال: الصحيح انه لا قضاء عليه الا انه يستحب له القضاء احتياطاً لامر العبادة وان لم ينضم الى الشك مثل ما ذكرنا من العلامة يستحب له ان يترك الاكل وان اكل لا يكون مسيئاً ولا قضاء عليه الا اذا كان اكبر رايه ان الفجر طالع فعينته يستحب له القضاء. (ص ٣٤٧ ج ٢)

(٥) وفي التتار خانية: اذا تسخّر وغالب رايه ان الفجر لم يطلع ثم تبين انه قد طلع فانه لا يجب عليه القضاء، بل يستحب له القضاء على الرواية الصحيحة. (ص ٣٤٩ ج ٢)

(٦) وفي التتار خانية: ولو اراد ان يتسحر بالتحرى فله

ذلك اذا كان بحال لا يسكنه مطلع الفجر بنفسه، وذكر
الشيخ شمس الايمة الحلواني ان من تسحر بكبر الراى لا
باس به اذا كان الرجل ممن لا يخفى عليه مثل ذلك وان
كان ممن يخفى عليه مثل ذلك فسيب له ان يدع الاكل، وان
اراد ان يتسحر بضرب الطبول السحرى فان كثر ذلك
الصوت من كل جانب وفي جميع اطراف البلدة فلا بأس
به، وان كان يستمع صوتا واحدا فان علمه عدالته يعتمد
عليه وان عرف فسقه لا يعتمد عليه، فان لم يعرف حالة
يحتاط ولا ياكل (تارخانيه ص ۳۴۷، ۳۴۸ ج ۲) ايضا شامى
(ص ۴۰۸ ج ۲)

(۷) وفي كتاب الاصل للامام محمد: قلت: ارايت رجلا
تسحر في شهر رمضان فشك في الفجر طلع ام لم يطلع؟
قال: احب الي اذا شك ان يدع الاكل والشرب قلت: فاذا
اكل وهو شك في الفجر؟ قال فصومه تام (كتاب الاصل
المعروف بالمبسوط ص ۲۰۹ ج ۲) والله تعالى اعلم

تحریر حضرت مفتی اعظم قدس سرہ

۱۳۶۸ھ ہجری اور ۱۹۴۸ء عیسوی میں جب احقر پاکستان کراچی میں آکر مقیم ہوا
تو یہاں کی عام مساجد وغیرہ میں اوقات کی ایک جنتری طبع کردہ حضرت حاجی وجیہ
الدین صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ آویزاں دیکھی اور بہت سے قابل اعتماد
حضرات سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس جنتری کے طلوع وغروب کو مختلف

مقامات پر مختلف زمانوں میں جانچا ہے اور صحیح پایا ہے، خود بھی جب کبھی جانچنے کا
موقعہ ملا تو اس کے طلوع وغروب کو صحیح پایا، اس لئے دوسرے اوقات کے معاملہ
میں بھی اس پر اعتماد کیا گیا۔

اب سے چند سال پہلے اپنے احباب میں سے بعض اعلیٰ علم نے کچھ نئی
تحقیق کر کے یہ قرار دیا کہ اس جنتری میں جو وقت صبح صادق کا دیا گیا ہے
در حقیقت وہ صبح کاذب کا ہے اور اس پر جدید و قدیم کے سچے اہل فن کے اقوال
بھی پیش کئے۔ چونکہ یہ احتمال غالب تھا کہ اس نئے اہل فن نے صبح کاذب اور
صادق میں فرق نہ کر کے کاذب ہی کو صبح کہہ دیا ہو اس لئے مجھے بھی صبح صادق
کے معاملہ میں تردد ہو گیا، بناء پر ہر رمضان میں نقشہ اوقات کے ساتھ یہ
نوٹ شائع کرنا شروع کیا کہ سحری کا کھانا تو قدیم جنتری کے وقت پر ختم کر دیا
جائے مگر صبح کی نماز اس کے بعد پندرہ بیس منٹ انتظار کے بعد پڑھی جائے۔

سال رواں میں بعض اہل فن حضرات کے ساتھ بحث و تمحیص اور جدید
فلکیات کی بعض کتابوں کی مراجعت سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جدید ماہرین
فلکیات نے خود صبح کاذب کو الگ کر کے بیان کیا ہے اور وہ در حقیقت رات کا حصہ
ہے، اس کے بعد جو صبح صادق ہوتی ہے اسی کو انہوں نے صبح کہا ہے، اس نئی
تحقیق اور بحث سے میرا تردد رفع ہو گیا اور میں قدیم جنتری کے اوقات کو حسابی
اعتبار سے صحیح سمجھتا ہوں، البتہ یہ حسابات خود یقینی نہیں ہوتے، نماز روزہ ہر
معاملہ میں احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہئے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲۳ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ

تحریر حضرت بنوری قدس سرہ

کچھ عرصہ سے کراچی اور چند اور شہروں میں نماز فجر اور سحری کے اوقات کے مختلف نقشے سامنے آئے جن کی وجہ سے عوام خاصے پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ کس پر عمل کریں اور کس کو صحیح سمجھیں، اس وقت چونکہ پوری تحقیق کا موقع نہ مل سکا تھا اس لئے احتیاطاً یہی فتویٰ دیا گیا کہ نماز کے لئے ان نقشوں پر عمل کیا جائے کہ جن میں صبح صادق کا وقت بعد تک ہے اور انتہائے سحری کا وقت ان سے لیا جائے جن میں وقت پہلے ختم ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں بعض مخلصین کی کوشش سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچی کہ تمام نقشوں میں وہی سابق کراچی کا نقشہ جس کو مرحوم حضرت حاجی وجیہ الدین صاحب خان بہادر نے مرتب کر دیا تھا اور چھاپا تھا وہ بالکل صحیح ہے۔ ہاں جس کا جی چاہے نماز دیر سے پڑھے تاکہ اس کو بھی یقین ہو جائے کہ وقت ہو گیا ہے اور اچھا ہے۔

دین کی بات میں ضد کی حاجت نہیں۔ جو بات صحیح ہو اس کو ماننا اور غلط بات سے رجوع کرنا یہ عین دین کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحیح سمجھ اور صحیح عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد یوسف بنوری صاحب

۲۲ رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ

خوانین کا تنہا سفرِ حج

خواتین کا تنہا سفر حج

(منقول از البلاغ شمارہ رمضان ۱۳۸۸ھ)

س: عورتوں کو حج فرض ادا کرنے کے لئے بغیر مرد کے سفر کرنا جائز ہے یا نہیں؟

آفتاب مہدی نظامی ڈیوڈی

ج: رسول اللہ ﷺ نے عورت کو اپنے شوہر یا محرم (ایسا مرد جس سے اس کا نکاح جائز نہیں) کے بغیر سفر کرنے سے سخت ممانعت فرمائی ہے، بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ:

”قال رسول الله لا يخلون رجلٌ بامرأةٍ ولا تُسافِرُ امرأةٌ الا ومعها محرمٌ فقال رجلٌ يا رسول الله اُكْتَبِتْ فِي غَزْوَةٍ كَذَا وَخَرَجَتْ امْرَأَتِي حَاجَةً؟ قَالَ اذْهَبْ فَاحْجُجْ مَعَ امْرَأَتِكَ“.

(مشکوٰۃ ص ۲۲۱ ج ۲ کتاب الحج)

”رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ کوئی مرد کسی (اجنبی) عورت سے تنہائی میں ہرگز نہ ملے، اور کوئی عورت ہرگز سفر نہ کرے سوائے اس صورت کے کہ اس کے ساتھ محرم ہو تو ایک شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرا فلاں فلاں جہاد کے لئے لکھ لیا گیا ہے، اور میری بیوی حج کو جا رہی ہو؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو۔“

معلوم ہوا کہ عورت کو اپنے شوہر یا محرم کے بغیر کوئی سفر کرنا جائز نہیں، خواہ وہ حج ہی کے لئے ہو اسی لئے فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ عورت پر اس وقت تک حج فرض ہی نہیں ہو تا جب تک کہ اس کے اپنا اور اپنے محرم کا خرچ سفر موجود نہ ہو تا کہ عورت اپنے خرچ پر محرم یا شوہر کو اپنے ساتھ لے جاسکے۔

اگر کسی عورت کے پاس اپنے اور محرم کے خرچ کے برابر روپیہ تو موجود ہو مگر شوہر یا کوئی محرم میسر نہیں جو اس کے ساتھ جاسکے تو ایسی صورت میں عورت پر حج کا نفس وجوب تو ہو جائے گا مگر جب تک کوئی محرم ساتھ جانے والا نہ ہو ادائیگی واجب نہ ہوگی اس لئے وہ یہ روپیہ محفوظ رکھے اور جب کوئی محرم ساتھ جانے والا مل جائے اس کے ساتھ حج کرے، اور اگر اخیر عمر تک نہ ملے تو عورت کے ذمہ واجب ہے کہ وصیت کر جائے کہ میری طرف سے حج بدل کر دیا جائے۔

اور اگر زندگی ہی میں بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے ایسی حالت ہوگئی کہ اگر محرم بھی ساتھ جانے والا مل جائے تو سفر نہ کر سکے تو ایسی صورت میں وہ اپنی زندگی میں بھی حج بدل کر سکتی ہے، بہر حال تنہا سفر جائز نہیں۔

(امداد الفتاویٰ جلد دوم ۲۸ کتاب الحج بحوالہ فتاویٰ شامیہ)



مہر کی کم سے کم مقدار

مہر کی کم سے کم مقدار

منقول از البلاغ: شمارہ شعبان ۱۳۸۸ھ

سوال: شریعت میں حق مہر کم سے کم کتنا ہونا چاہئے؟

(آفتاب مہدی نظامی ڈیریوی)

جواب: مہر نکاح کی کم سے کم مقدار دس درہم چاندی ہے جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دو تونے ساڑھے سات ماشہ ہوتی ہے چنانچہ اس مقدار سے کم مہر مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ مہر چاندی کے علاوہ نقدی، سونے یا سامان کی صورت میں ہو تو وہ بھی چاندی کی مذکورہ مقدار کی قیمت سے کم نہیں ہونا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

”لا مہر دون عشرة دراهم“

(بذل المجہود ص ۳۲ عن البہیقی)

کوئی مہر دس درہم سے کم (معتبر) نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے (ہدایہ)

ورکرز پارٹی سلیپشن فنڈ
کی شرعی حیثیت

کارخانوں کے منافع میں مزدور کی شمولیت ورکرز پارٹی سپیشن فنڈ کی شرعی حیثیت

(منقول از "البلاغ" صفر المظفر ۱۳۹۷ھ)

حکومت پاکستان نے ۱۹۶۸ء میں ایک قانون جاری کیا جو "ورکرز پارٹی سپیشن فنڈ" (Workers Participation Fund) سے متعلق تھا، یعنی اس قانون کے ذریعے کارخانہ داروں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ ہر سال اپنے کارخانے کے منافع کا ڈھائی فیصد حصہ ان مزدوروں اور ملازمین کے لئے خاص کریں جو ان کے کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے اس ڈھائی فیصد منافع کا الگ فنڈ قائم کرنا طے کیا گیا تھا تاکہ اس فنڈ کی رقم کو نفع بخش کاموں میں لگا کر اس سے حاصل شدہ رقع ملازمین میں تقسیم کی جائے اور اصل فنڈ نفع بخش کاموں میں لگا رہے۔

اس کا شرعی جواز معلوم کرنے کے لئے جب سوالات کی کثرت ہوئی تو اس مسئلہ کو مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع قدس سرہ نے مجلس مسائل تحقیق حاضرہ میں پیش کیا جس میں تفصیلی بحث و تجویز کے بعد ایک جواب اصولی طور پر طے کر دیا گیا اور اسے مفصل و مدلل کر کے ضبط تحریر میں لانے کا کام مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی کا مدظلہم کے سپرد کیا گیا۔

موصوف نے اپنی یہ مفصل تحقیق اگلی مجلس میں پیش کی، مجلس نے اس کو بعینہ منظور کیا اور مندرجہ ذیل بزرگوں نے تصدیق و تخطیث فرمائیں۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ

شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف بنوری قدس سرہ
حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ
حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ حکومت پاکستان نے ایک قانون تجریہ ۱۹۶۸ء بابت ورکرز پارٹی سپیشن فنڈ (کارخانوں کے ملازمین کی منافع میں شمولیت کا فنڈ) نافذ کیا ہے جس کی رو سے مالکان کو اس امر کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ ہر سال اپنے کارخانہ کے منافع کا $2\frac{1}{2}$ فیصد ^(۱) حصہ ان مزدوروں اور ملازمین کے لئے خاص کریں جو ان کے کارخانہ میں کام کرتے ہیں اس قانون کی رو سے اس $2\frac{1}{2}$ فیصد منافع کا الگ فنڈ قائم کر دیا جاتا ہے۔

اس فنڈ میں ان تمام ملازمین کا حصہ ہوتا ہے جنکی تنخواہ زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپیہ ماہوار تک ہو لیکن ان ملازمین کی تین قسمیں تنخواہ کی کمی بیشی کی بنیاد پر کر کے فنڈ کو ان تین قسموں پر منقسم کر دیا جاتا ہے پھر ہر قسم کے حصہ میں فنڈ کی جتنی رقم آئی اس میں اس قسم کے تمام ملازمین برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

اس فنڈ کو قائم رکھنے اور بڑھانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ فنڈ کی اصل رقم ملازمین کو فی الحال نہیں دی جاتی بلکہ اسے نفع بخش کاموں میں لگا کر اس سے حاصل شدہ نفع ملازمین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اصل فنڈ نفع بخش کاموں

(۱) پہلے حکومت کی طرف سے اتنی مقدار $2\frac{1}{2}$ فیصد ہی مقرر تھی لہذا اس تحریر میں ہر جگہ یہی مقدار لکھی گئی ہے بعد میں حکومت نے مقدار اس سے زائد مقرر کر دی مگر اس سے شرعی حکم میں کوئی فرق نہیں آتا مقدار $2\frac{1}{2}$ فیصد ہو یا $3\frac{1}{2}$ فیصد یا اس سے کم و بیش سب کا حکم وہی ہے جو آٹھ فیصد سے بیان ہوا۔ رفیع

میں لگا رہنا ہے اور اس میں جتنا جتنا حصہ ہر ملازم کا ہے اس کے حساب میں بکھا رہتا ہے۔ اختتام ملازمت پر اس کا وہ اصل حصہ بھی اسے دیدیا جاتا ہے:

اصل فنڈ کو نفع بخش کاموں میں لگانے میں اور اس سے حاصل شدہ نفع ملازمین کو دینے کا طریقہ یہ ہے کہ:

(۱)۔ اگر فنڈ کا سرمایہ ٹریسٹوں کا بورڈ کمپنی سے باہر لگائے یعنی دیگر کمپنیوں کے حصے وغیرہ خریدے تو جو منافع ان حصوں میں ملے گا وہ ملازمین کے حصوں کی نسبت سے تقسیم کر دیا جائے گا۔

(۲)۔ اگر فنڈ کا سرمایہ خود کمپنی اپنے پاس رکھتی ہے تو وہ سرکاری قانون کے مطابق اس فنڈ پر مزید منافع دینے کی پابند ہے جس کی شرح یا تو بینک کی شرح سود سے $2\frac{1}{2}$ فیصد زیادہ ہونی چاہئے یا کمپنی اپنے حصہ داروں کو جو منافع ادا کرتی ہے اس کی شرح کا کچھتر فیصد ہونا چاہئے ان دونوں رقم میں جو رقم زیادہ ہوگی وہ مزدوروں کو دینا پڑے گی مثلاً شرح بینک ۵ فیصد ہے اور $2\frac{1}{2}$ فیصد ملا کر $7\frac{1}{2}$ فیصد ہو واجب کہ کمپنی نے اپنے حصہ داروں کو جو منافع یعنی (ڈی ڈی ڈی) دیا ہے مثلاً وہ بیس فیصد ہے تو بیس فیصد کا کچھتر فیصد ۱۵ فیصد ہوا اور ۱۵ فیصد $7\frac{1}{2}$ فیصد سے زائد ہے اس لئے حکومت کے قانون کے مطابق کمپنی ملازمین کے فنڈ پر ۱۵ فیصد کے حساب سے منافع دینے کی پابند ہے۔

مذکورہ حالات کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے۔

۱۔ ملازمین کو جو $2\frac{1}{2}$ فیصد منافع دینا قانوناً طے کیا گیا ہے شرعاً یہ اجرت ہے

یا انعام؟

۲۔ اگر اجرت ہے تو کیا حکومت کو اجیر و مستأجر کے درمیان کوئی اجرت

بذریعہ قانون مقرر کرنے کا شرعاً اختیار ہے؟ اور کیا حکومت کے اجرت مقرر

کر دینے سے اجارہ فاسد تو نہ ہو جائے گا؟

۳۔ $2\frac{1}{2}$ فیصد منافع مجہول ہے کیونکہ کچھ نہیں معلوم کہ نفع ہوگا بھی یا نہیں؟ اور

اگر ہوا تو کتنا ہوگا؟ لہذا اس جہالت کے باعث اجارہ فاسد تو نہ ہوگا؟

۴۔ یہ $2\frac{1}{2}$ فیصد منافع ظاہر ہے کہ ملازمین ہی کے عمل سے حاصل ہوتا ہے

تو کیا یہ صورت فقیر الطحان کے حکم میں ہو کر ناجائز تو نہ ہوگی؟

۵۔ اس منافع کی رقم وصول ہونے پر پچھلے سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا

نہیں؟

۶۔ اصل فنڈ ($2\frac{1}{2}$ فیصد) کو نفع بخش کاموں میں لگا کر جو مزید نفع حاصل کیا

جاتا ہے اور ملازمین کو دیا جاتا ہے بعض صورتوں میں یہ بظاہر سود معلوم ہوتا ہے۔

اسکا لینا بھی ملازمین کو جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس پر زکوٰۃ کا وہی حکم ہے

جو اصل فنڈ کی زکوٰۃ کا ہے یا کچھ اور؟ براہ کرم سب سوالات کا مفصل اور مدلل

جواب ارشاد فرمائیں۔ ”والسلام“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلامٌ على عباده الذين اصطفى

الجواب وهو الموفق للصواب

مذکورہ سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ:-

۱- چونکہ یہ $2\frac{1}{2}$ فیصد منافع ملازمین کو ان کی کارکردگی کے عوض میں دیا جاتا ہے اور اس کا دینا اجیر و مستأجر کے باہمی معاہدے سے طے پاتا ہے حتیٰ کہ اگر مالکان کارخانہ دینے سے انکار کر دیں تو ملازمین کو اس کے مطالبہ کا اور عدالتی چارہ جوئی کا اختیار ہوتا ہے اس لئے شرعاً اس منافع کو اجرت ہی کا حصہ قرار دیا جائے گا، اور اس پر سب وہی احکام جاری ہوں گے جو اجرت پر ہوتے ہیں۔

۲- شرعاً اجیر و مستأجر کے درمیان اجرت مقرر کرنے کا اختیار حکومت کو دو شرطوں کے ساتھ ہے۔ ایک یہ کہ اجیر و مستأجر کے درمیان انصاف قائم کرنا اور لوگوں کو مشکلات سے بچانا اجرت مقرر کئے بغیر حکومت کے لئے ممکن نہ ہو، دوسری یہ کہ حکومت اجرت مقرر کرنے میں انصاف سے کام لے یعنی ماہرین اور اہل الرائے کے مشورہ سے اتنی اجرت مقرر کرے جو مزدور کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور مستأجر کے لئے ممکن العمل بھی۔ ان دو شرطوں میں سے ایک بھی مفقود ہوگی تو اجرت کرنے والے حکام گناہ گار ہوں گے، مگر اجارہ کسی حال میں فاسد نہ ہوگا خواہ حکومت نے شرائط کو ملحوظ رکھا ہو یا نہ رکھا ہو۔

۳- اس منافع میں جس درجہ کی جہالت ہے اسکی وجہ سے اجارہ فاسد نہیں

ہوگا۔

۴- یہ صورت ”فقیر الطحان“ کی صورت سے مختلف ہے اور اس کے حکم میں بھی نہیں، لہذا جائز ہے۔

۵- اس منافع کی رقم وصول ہونے پر زکوٰۃ کا حکم وہی ہے جو ”پراویڈنٹ فنڈ“ کی زکوٰۃ کا ہے، یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، وصول ہونے کے بعد جب اس پہ سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ یہ رقم بقدر نصاب ہو یا ملازم کے پاس پہلے سے اتنا مال موجود ہو کہ اس کے ساتھ ملکر مقدار نصاب کو پہنچ جاتی ہو۔

صاحبین اور بعض دوسرے فقہاء کرام کے نزدیک سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی، لہذا بہتر اور افضل یہ ہے کہ سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ بھی دے دی جائے۔

۶- یہ مزید نفع اگرچہ بعض صورتوں میں بظاہر سود معلوم ہوتا ہے مگر شرعاً یہ سود کے حکم میں نہیں، بلکہ کارخانہ کی طرف سے ایک قسم کا انعام ہے جو ملازمین کو لینا اور اپنے استعمال میں لانا جائز ہے، اور اسکی زکوٰۃ کا حکم یہ ہے کہ اس پر سالہائے گزشتہ کی زکوٰۃ کی نہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک واجب ہے نہ صاحبین کے نزدیک، اور باقی تفصیل اس میں بھی وہی ہے جو اصل فنڈ کی زکوٰۃ کے بارے میں۔ اوپر بیان ہوئی۔ ان مسائل کی تفصیل حسب ذیل ہیں:-

مسائل زیر بحث کی تفصیل

۱- جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے اس میں مزید کسی تفصیل کی ضرورت نہیں، جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وضاحت کے لئے کافی ہے۔

۲- تسعیر فی الاجرت کا مسئلہ

دوسرے مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے اشیاء کا نرخ یا محنت کی اجرت مقرر کرنے کو ”تسعیر“ کہا جاتا ہے، اس سلسلہ میں شریعت کا اصل قانون تو یہ ہے کہ تسعیر جائز نہیں؛ وجہ یہ ہے کہ اسلام کا نظام تجارت و معیشت ایسے متوازن اصولوں پر قائم ہے کہ اس میں تسعیر کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، کیونکہ اس نظام میں تاجروں اور مالداروں کی اجارہ داریاں قائم ہی نہیں ہو سکتیں کہ وہ من مانی قیمت وصول کر سکیں، اسلامی نظام تجارت میں مقابلہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ہر تاجر کم سے کم قیمت پر اشیاء فروخت کئے بغیر نفع نہیں کما سکتا، اور مناسب اجرت دیئے بغیر کسی کا کارخانہ دار کو مزدور نہیں مل سکتا۔

لہذا عام حالات میں اسلام نے بائع و مشتری اور اجیر و مستأجر کو آزاد رکھا ہے کہ باہمی رضامندی سے جو قیمت یا اجرت طے ہو جائے وہی صحیح ہے، کسی تیسرے کو اس میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دی، -سنن ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ

ان رجلاً جاء فقال يا رسول الله سَعَرْتُ فَقَالَ بَلْ ادْعُوا ثَمَّ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ سَعَرْتُ فَقَالَ بَلْ اللَّهُ يَخْفِضُ وَيَرْفَعُ وَانِي لَارْجُوَانِ الْقَيْ لَ اللَّهِ وَلَيْسَ لَاحِدٍ عِنْدِي مَظْلَمَةٌ (كتاب البيوع كتاب التسعير ص ۳۸۹)

ایک شخص نے آ کر کہا ”یا رسول تسعیر فرما دیجئے“ آپ نے فرمایا (نہیں) بلکہ میں (قیمتیں کم ہونے کی) دعا کروں گا پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے بھی تسعیر کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا (نہیں) بلکہ اللہ ہی (نرخ) کم اور زیادہ کرتا ہے اور میں اللہ سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ کسی کا مارا ہوا حق میرے

ذمہ نہ ہو۔

اسی مضمون کو حدیث ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کر کے اسے ”حَسَنٌ صَحِيحٌ“ کہا ہے اس کے آخر میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَانِي لَارْجُوَانِ الْفَقِي الْاَللَّهِ وَلَيْسَ اَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلَمَةٍ مِنْ دَمٍ وَلَا مَالٍ (جامع ترمذی ص ۱۱۹۲ ابواب البيوع)

میں اپنے رب سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی بھی مجھ سے کسی جان یا مال کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔

لیکن اگر غلط نظام تجارت کے باعث تاجروں اور مال داروں کی اجارہ داریاں اس حد تک قائم ہو جائیں کہ وہ قیمتیں دوگنی یا اس سے بھی زائد وصول کرنے لگیں اور حکومت دیانت داری سے یہ محسوس کرے کہ تسعیر کے بغیر چارہ کار نہیں تو ایسی صورت میں فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ ماہرین کے مشورے سے تسعیر جائز ہے، بلکہ امام مالکؒ نے تو ایسی صورت میں تسعیر کو واجب قرار دیا ہے۔ (کسائی فی العبارة الاذنی)

اور چونکہ اس جیسے مسائل میں بیع اور اجارہ کے احکام یکساں ہیں لہذا فقہاء کرام نے لوگوں کو ظلم و چور سے بچانے کے لئے اجارہ میں بھی تسعیر فی الاجر کو جائز قرار دیا ہے، مثلاً البحر الرائق کتاب القسمة میں صراحت ہے کہ مشترک جائدادیں شرکاء میں تقسیم کرنے والا (قاسم) جب لوگوں سے اجرت لے کر یہ کام کرتا ہو تو حکومت کو چاہئے کہ وہ اتنی اجرت مقرر کر دے جو اس کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہو اور لوگوں کے لئے قابل اعتماد بھی، (کسائی فی العبارة الثانیة)

خلاصہ یہ کہ تسعیر فی الاجرت دو شرط کے ساتھ جائز ہے، ایک یہ کہ اجیر

ومتأجر کے درمیان انصاف سے کام لے یعنی اجرت ایسی مقرر کرے جو ماہرین اور اہل الرائے کے نزدیک مزدور کی محنت کا مناسب صلہ بھی، اگر ایک شرط بھی ترک کی جائے گی تو تسخیر کرنے والے حکام گناہ گار ہوں گے مگر اجارہ کسی حال میں فاسد نہ ہوگا خواہ حکومت نے ان شرائط کو ملحوظ رکھا ہو یا نہ رکھا ہو۔

رہا یہ سوال کہ تسخیر خواہ شرائط کے مطابق ہو یا شرائط کے بغیر، اجارہ دونوں صورتوں میں فاسد ہونا چاہئے اسلئے کہ زیادہ اجرت پر مالکان کا رخانہ دل سے راضی نہ ہوں گے محض حکومت کے خوف سے اس اجرت پر معاملہ کریں گے تو یہ صورت ”اجارۃ المکرہ“ کی ہوئی اور اگر اس کی صورت میں فقہاء نے صراحت کی ہے کہ بیع اور اجارہ دونوں فاسد ہو جاتے ہیں؟ (کسائی فی العبارة الثالثة)

جواب یہ ہے کہ حکومت نے مالکان کا رخانہ کو عقد اجارہ پر نہیں بلکہ اجرت کی ایک مقدار پر مجبور کیا ہے کہ اس سے کم نہ دیں لہذا یہ صورت ”اجارۃ المکرہ“ میں داخل نہیں پس اجارہ صحیح ہوگا (کسائی فی العبارة الرابعة) تسخیر کے بارے میں فقہاء کی عبارت درج ذیل ہیں۔

العبارات المتعلقة بمسئلة التسعير

العبارة الاولى: - في الهداية من كتاب الكراهية ص ۴۷۰ ج ۴: ولا ينبغي للسلطان ان يسعر على الناس لقوله عليه السلام لا تسعروا فان الله هو المسعر القابض الباسط الرازق، ولان الثمن حق العاقد فاليه اقديره فلا ينبغي للامام ان يتعر من لحقه الا اذا تعلق به دفع ضرر العامة (الى قوله) فان كان ارباب الطعام يتحكمون ويتعدون عن القيمة تعديا فاحشا وعجز القاضي عن صيانة حقوق المسلمين الا بالتسعير فحينئذ

لابأس به بمشورة من اهل الرائي والبصيرة اه وفي الدر المختار من كتاب المحظر والاباحة ص ۴۰۰ ج ۶: وقال مالک: "على الوالى التسعير عام الغلاء (الى قوله) اذا تعدى ارباب غير القوتين وظلموا على العامة فيسعر عليهم الحاكم بناء على ما قال ابو يوسف ينبغي ان يجوز ذكره القهستاني فان ابا يوسف يعتبر حقيقة الضرر كما تقرر (وقال الشامي تحية) قوله بناء على ما قال ابو يوسف اى من ان كل ما اضر بالعامة حبسه فهو احتكار ولو ذنباً او فضة او ثوباً قال: وفيه ان هذا في الاحتكار لا في التسعير اه قلت نعم ولكنه يؤخذ قياساً او ابتباطاً بطريق المفهوم ولذا قال "بناء على ما قال ابو يوسف" ولم يجعله قوله تأمله على انه تقدم ان الامام يرى المحجر اذا عم الضرر كما في المفتى الماجن والمكاري المفلس والطبيب الجاهل وهذه قضيه عامة فتدخل مسئلتنا فيها لان التسعير حرج معنى لانه منع عن البيع بزيادة فاحشة وعليه فلا يكون مبني على قول ابي يوسف فقط كذا ظهر لي فتأمل اه

العبارة الثانية: - في البحر الرائق من كتاب القسمة (ص ۱۶۸ و ۱۶۹ ج ۸): والا نصب قاسماً بقسم باجرة بعدد الرؤس يعنى ان لم ينصب قاسماً رزقه في بيت المال نصبه وجعل رزقه على المتقاسمين لان النفع لهم على الخصوص (الى قوله) ويقدر له القاضي الاجرة مثله كى لا يطمع في اموالهم ويتحكم

بالزیادة:

العبارة الثالثة: - فی الهدایة من کتاب الکراه (ص ۳۳۴ ج ۳): واذا اکره الرجل علی بیع ماله او علی شراء سلعته او علی ان یقر لرجل بالف او یواجر داره واکره علی ذلک بالقتل او بالضرب الشدید او بالحبس فباع او اشتري فهو بالخيار ان شاء امضى البیع وان شاء فسخه ورجع المبیع، لان من شرط صحة هذه العقود التراضی، قال الله تعالی ﴿إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم﴾ والإکراه بهذه الاشیاء یعدم الرضا فتفسد.

العبارة الرابعة: - فی در المختار من کتاب الحظر والاباحه (ص ۴۰۰ ج ۶) قالوا فیمن صادره السلطان بمال ولم یعین بیع ماله فصار یبیع املاکه بنفسه ینفذ بیعه. لانه غیر مکره علی البیع، وهنا (ای فی مسئلة التسعیر) کذا لک لان له ان لا یبیع اصلاً ولذا قال فی الهدایة "ومن باع منهم بما قدره الامام صح لانه غیر مکره علی البیع اه لان الامام لم یأمره بالبیع وانما امره ان لا یزید الثمن علی کذا وفرق بینهما فلیتأمل.

۳- جهالة فی الاجرة کا مسئلہ:-

اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ $2\frac{1}{2}$ فیصد اصل منافع میں جو جہالت پائی جاتی ہے اس سے بھی اجارہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ فقہاء کرام نے صراحت فرمائی ہے کہ اجرت میں صرف وہی جہالت مفید عقد ہے جو مفوضی الی النزاع ہو اور جو جہالت

نزاعات کا سبب نہ بنتی ہو اس سے اجارہ فاسد نہیں ہوتا (کما سیأتی فی العبارة الاولى).

چنانچہ فقہاء کرام نے اجارہ کی ایسی بہت سی صورتوں کو کہ جن میں اجرت حقیقہً مجہول ہے مگر عرف عام میں اسے مجہول نہیں سمجھا جاتا اور اس سے نزاعات پیدا نہیں ہوتے جائز قرار دیا ہے مثلاً دلال کی اجرت کسی خاص مگر عدد کی صورت میں مقرر نہیں کی جاتی بلکہ فیصد کے تناسب سے طے کی جاتی ہے مگر اس جہالت کے باوجود یہ معاملہ فقہاء کرام نے اسی لئے جائز قرار دیا کہ وہ مفوضی الی النزاع نہیں اور لوگوں میں اس کا بکثرت رواج ہے۔ (کما سیأتی فی العبارة الثانية)

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کے غلام کو مزدوری پر لے اور یومیہ مزدوری متعین کر دے مگر ساتھ ہی یہ طے ہو جائے کہ غلام کا کھانا بھی متناً جو کے ذمہ ہوگا تو اس صورت میں مزدوری کا ایک حصہ جو یومیہ مقرر ہوا وہ تو مجہول نہیں مگر کھانا مجہول ہے کہ نہ اسکی نوعیت معلوم ہے نہ مقدار مگر فقہ ابو الیث نے اس بناء پر اسے جائز قرار دیا کہ لوگوں میں یہ معاملہ بغیر نزاع کے رائج ہے لہذا یہ جہالت قابل اعتبار نہیں، لیکن اگر یہی صورت غلام کی بجائے کسی جانور کے بارے میں طے ہو کہ اس کا ایک خاص کرایہ مقرر کر دیا جائے مگر ساتھ ہی جانور کا چارہ بھی بذمہ متناً جو طے ہو تو فقہ ابو الیث نے اسے جائز قرار نہیں دیا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ پہلی صورت عرف عام کی وجہ سے مفوضی الی النزاع نہیں برخلاف دوسری صورت کے اس کا عرف نہ ہونے کی وجہ سے وہ مفوضی الی النزاع ہے۔

چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کبھی جانور کے اجارہ کی مذکورہ صورت کا عرف ہو جائے تو یہ بھی فقہ ابو الیث کے نزدیک جائز ہونی چاہئے (سیأتی بذالک فی العبارة الثالثة مصرحاً)

یہ اصول واضح ہو جانے کے بعد اسب زیر بحث مسئلہ کو دیکھئے کہ یہاں بھی

تقریباً وہی صورت ہے جو غلام کے مسئلہ میں تھی کہ کارخانہ کے ملازمین کی اجرت کا ایک بڑا حصہ تو تنخواہ کی صورت میں دیا جاتا ہے جو معین اور معلوم ہے اور اجرت کا دوسرا حصہ جو $\frac{1}{2}$ فیصد سالانہ منافع کی صورت میں دیا جاتا ہے مجہول ہے اور اسکی جہالت ایسی ہی ہے جیسی غلام کے کھانے میں تھی بلکہ غلام کے کھانے کے معاملہ کا عرف جتنا مستحکم اور نزاعات سے دور ہے اس سے کہیں زیادہ مستحکم عرف اس نفع کا معلوم ہوتا ہے جو ملازم کو دیا جاتا ہے کیونکہ اس معاملہ کو نہ صرف پورے ملک کے تمام کارخانہ داروں اور مزدوروں نے تسلیم کیا ہے بلکہ حکومت نے اسے ایک قانون کی شکل دے دی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس نفع کی جہالت چونکہ مفضی الی النزاع نہیں اور پورے ملک میں اس کا عرف حکومت کے زیر سرپرستی ہو گیا ہے لہذا اس جہالت سے اجارہ فاسد نہیں ہوگا۔

ہاں آئندہ اگر تجربات سے معلوم ہو کہ اس جہالت کے باعث اجیر و مستأجر میں نزاعات پیدا ہونے لگے ہیں جو حسابات سے بھی مرتفع نہیں ہوتے تو اس وقت اس اجارہ کو فاسد قرار دیا جائے گا۔

اس مسئلہ کے متعلق عبارات فقیہیہ درج ذیل ہیں :-

العبارة الاولى: - فی الدر المختار (ص ۵۱ الی ۵۳ ج ۶) وجاز اجارة الحمام (الی قوله) والظنر بكسر فہمز المرضعة بأجر معین لتعامل الناس (الی قوله) وكذا يطعامها وكسوتها ولها الوسط وهذه عند الامام لجريان العادة (وقال الشامي تحته) قوله لجريان العادة جواب عن قولهما. لا تجوز لان الاجرة مجهولة وجهه ان عادة لما جرت بالتوسعة على الظنر

شفقة على الولد لم تكن الجهالة مفضية الى النزاع والجهالة ليست بممانعة لذاتها بل لكونها مفضية الى النزاع اهـ

العبارة الثانية: - فی در المختار (ص ۶۳ ج ۶) قال فی التاترخانية فی الدلال والسمسار يجب اجر المثل، وماتواضعوا عليه ان فی كل عشرة دنانیر كذا فذا لك حرام عليهم وفي الحادی سئل محمد بن سلمة عن اجرة السمسار فقال ارجوا انه لا بأس به وان كان فی الاصل فاسد الكثرة التعامل وكثير من هذا غیر جائز فجوزوه لحاجة الناس اليه.

العبارة الثالثة: - وفي در المختار (ص ۴۷ ج ۶) استأجر عبداً او دابةً على ان يكون علفه على المستأجر ذكر فی الكتاب انه لا يجوز وقال الفقيه ابو الليث فی الدابة ناخذ بقول المتقدمين اما فی زماننا فالعبد يأكل من مال المستأجر عادة، قال الحموی ای فیصح اشتراطه واعتراض، بقوله فرق بين الاكل من مال المستأجر بلا شرط ومنه بشرط (قال الشامي) اقول المعروف كالمشروط وبه يشعر كلام الفقيه كما لا يخفى على المبنية ثم ظاهر كلام الفقيه انه لو عورف فی الدابة ذالك يجوز تأمل.

۴ - یہ صورت تفسیر الطحان سے مختلف ہے :-

رہا یہ سوال کہ کارخانہ کے منافع میں سے جو $\frac{1}{2}$ فیصد حصہ ملازمین کو ملتا ہے وہ ملازمین کے عمل سے حاصل ہوتا ہے اور فقہاء نے صراحت کی ہے کہ ایسی چیز کو

اجرت ٹھہرانا جو خود اجیر کے عمل سے وجود میں آئی ہو جائز نہیں حدیث میں اسی لئے ”قفیز الطحان“ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے کہ آٹے کی جو خاص مقدار آٹا پیسنے والے کی اجرت ٹھہرائی گئی وہ وجود اجیر ہی کے عمل سے وجود میں آئی ہے (کمائیاتی فی العبارة الاولیٰ)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ زیر بحث منافع اور قفیز الطحان کی ضرورت میں ایک فرق تو یہ ہے کہ قفیز الطحان میں بعینہ اس آٹے کے ایک حصہ کو اجرت قرار دیا جاتا ہے جو اجیر کے عمل سے وجود میں آیا ہے اور زیر بحث مسئلہ میں اس پیداوار کے کسی حصہ کو اجرت نہیں بنایا جاتا جو ملازمین کے عمل سے وجود میں آئی ہے بلکہ اس پیداوار کو فروخت کرنے سے جو منافع کارخانہ کو حاصل ہوتا ہے اس کے ایک حصہ کو اجرت بنایا جاتا ہے۔

اور دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں یہ شرط کسی فریق کی طرف سے نہیں کہ جو روپے کارخانہ کو نفع میں حاصل ہوں بعینہ انہی میں سے $2\frac{1}{2}$ فیصد روپے ملازمین کو دیئے جائیں بلکہ شرط صرف یہ ہے کہ روپے کی جتنی مقدار نفع میں حاصل ہو اس مقدار کا $2\frac{1}{2}$ فیصد حصہ ملازمین کو دیا جائے خواہ بعینہ اسی روپے میں سے دیں یا دوسرے روپے میں سے اور اس صورت کو فقہاء نے صراحتاً جائز قرار دیا ہے چنانچہ ”قفیز الطحان“ ہی کے مسئلہ میں فرمایا ہے کہ اگر آٹا پیسنے والے کی اجرت مطلق ایک قفیز آٹا مقرر کی جائے اور یہ شرط نہ لگائی جائے کہ بعینہ اس آٹے کا قفیز دیا جائے گا جو اجیر نے اس گندم سے پیسا ہے تو یہ معاملہ جائز ہے پھر اگر اتفاقاً متاسراً اسی آٹے میں سے ایک قفیز اجیر کو دیدے تو اجارہ جائز رہے گا،

(کمائیاتی مصرحاً فی العبارة الثانیہ)

خلاصہ یہ کہ زیر بحث $2\frac{1}{2}$ فیصد منافع کسی طرح قفیز الطحان کے حکم میں نہیں

آتا۔

العبارات المتعلقة بمسئلة قفیز الطحان

العبارة الاولى: فی الهدایة (کتاب الاجارات ص ۳۰۳ ج ۳) ومن دفع المی حائک غزلاً لیسجہ بالنصب فله اجر مثله وكذا اذا مستاجر حماراً یحمل علیہ طعاماً بقفیز منه فالاجارة فاسدة لانه جعل الاجر بعض ما یمخرج من عمله فیصیر فی معنی قفیز الطحان وقد نهی النبی علیہ السلام عنه وهو ان یمستاجر ثوراً یطحن له حنطة بقفیز من دقیقه وهذا اصل کبیر یعرف به فساد کثیر من الاجارات لا سیما فی دیارنا والمعنی فیہ ان المستاجر عاجز عن تسلیم الاجر وهو بعض المنسوج او المعمول وحصوله بفعل الاجیر فلا یعدّ هو قادراً بقدرۃ غیره.

العبارة الثانية: فی الدر المختار (ص ۵۷ ج ۶) والحیلة ان یفرز الاجر اولاً او یمسّی قفیز ایلًا لبتعین ثم یعطیه قفیزاً منه یمحوز (قال الشامی تحتہ) قوله والحیلة ان یفرز الاجر اولاً ای ویسلمه الی الجیر فلو خلطه بعد وطحن الكل ثم افرز الاجرة ورد الباقي جاز ولا یکون فی معنی قفیز الطحان اذ لم یمستاجرہ ان یطحن بجزء منه او بقفیز منه کما فی المنع عن جواهر الفتاوی، قال الرملى وبه علم بالاولیٰ جواز ما یفعل فی دیارنا من اخذ الاجرة من الحنطة والدراهم معاً ولا شک فی جوازه اھـ

(قال الشامی) قوله بلا تعیین ای من غیر ان یشترط انه من
المحمول او من المطحون فیجب فی ذمة المستاجر. زیلعی.

۵۔ اس فنڈ پر زکوٰۃ کا مسئلہ

زکوٰۃ کے بارے میں اس فنڈ کا حکم بعینہ وہی ہے، جو اپراؤنڈنٹ فنڈ کا ہے کہ فنڈ کا وصول ہونے سے پہلے زمانہ کی زکوٰۃ ملازم پر واجب نہیں، اور تفصیل اس کی ہے کہ پہلے سوال کے جواب میں بتایا جا چکا ہے کہ یہ منافع دراصل ملازمین کی اجرت ہی کا ایک حصہ ہے اور آزاد انسان کی محنت پر جو اجرت مستاجر کے ذمہ بطور دین واجب ہوتی ہے فقہی اصطلاح میں اسے ”دین ضعیف“ قرار دیا جائے گا کیونکہ دین ضعیف اس دین کو کہا جاتا ہے جو یا تو کسی چیز کا عوض ہی نہ ہو۔ جیسے میراث یا اگر عوض ہو تو جس چیز کا عوض ہے وہ مال نہ ہو جیسے بیوی کا مہر اور یہاں یہی صورت ہے کہ ملازم کی اجرت اس کی کارکردگی کا عوض ہے اور ظاہر ہے کہ آزاد انسان کی کارکردگی مال نہیں لہذا ملازمین کے اس فنڈ کو دین ضعیف قرار دیا جائے گا۔

اور دین ضعیف کا حکم زکوٰۃ کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ہے کہ جب وہ بقدر نصاب وصول ہو جائے اور وصول ہونے کے بعد سال گذر جائے تب اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وصول ہونے سے پہلے جتنا زمانہ اس دین پر گذرا اس کی زکوٰۃ وائے پر واجب نہیں البتہ صاحبین اور بعض دوسرے فقہاء کرام کے نزدیک وصول ہونے کے بعد گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا واجب ہے۔

اس قسم کے دین پر ایام گزشتہ کی زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی امام اعظمؒ کی

طرف سے فقہاء کرام نے دو وجہ بتلائی ہیں ایک یہ کہ اس دین کی رقم وصول ہونے سے پہلے مال ہی نہیں بلکہ صرف حق ہے لہذا ابھی وہ ملازم کی ملک میں بھی داخل نہیں اور جب اس کی ملک ہی نہیں تو وجوب زکوٰۃ کے کوئی معنی نہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر اس کو مال اور ملک بھی تسلیم کر لیں تو ملک ناقص ہے کیونکہ ملک تام (کامل یا مطلق) وہ ہے جو رقبہ دیدہ ہو یہاں اگر رقبہ ملک تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ اس کی ملکیت میں نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ملکیت اس پر تام نہیں (کما یأتی فی العبارة الاولی) یہی حال دین ضعیف کا ہے کہ ملک تام ہونے کی شرط اس میں موجود نہیں لہذا اس رقم کے وصول ہونے سے پہلے ایام کی زکوٰۃ اس پر لازم نہیں (وہذا لکھ مصرح فی العبارة الثانیۃ الآتیۃ)

ان دو وجہوں میں سے جسکو صحیح ترجیح دیجائے بہر حال ان سے اتنا معلوم ہوا کہ زیر بحث منافع وصول ہونے سے پہلے یا تو اس کی ملکیت نہیں یا کم از کم ملک ناقص ہے لہذا وصول ہونے اور اس پر سال گذرنے سے پہلے اس کی زکوٰۃ ملازم کے ذمہ واجب نہیں۔

لیکن یاد رہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب کہ یہ منافع ملازم نے نہ خود وصول کیا ہو نہ اس کے کسی وکیل نے، چنانچہ اگر اس کی اجازت سے اس کے حصہ کا نفع کسی دوسری مستقل کمپنی یا ٹرسٹ وغیرہ کی تحویل میں اس طرح دے دیا گیا کہ مالکان کارخانہ اب اس کی ادائیگی سے سبکدوش قرار دیئے جائیں تو جس کمپنی کی تحویل سے یہ رقم دی گئی ہے وہ کمپنی اس ملازم کی وکیل ہوگی اور وکیل کا قبضہ مکمل کے قبضہ کے حکم میں ہوتا ہے لہذا اس کمپنی کی تحویل میں جانے کے بعد جب اس رقم پر ایک سال گذر جائے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا اگرچہ وہ رقم ابھی ملازم کی تحویل میں حقیقتہً نہ آئی ہو۔ فقہاء کرام کی مندرجہ ذیل عبارات اس سلسلہ میں

صريح اور کافی ہیں۔

العبارات المتعلقة بمسئلة زكوة هذا المال

العبارة الاولى:- في البحر الرائق ص ۲۱۸ ج ۲ اول كتاب الزكوة قوله وملك نصاب الخ اطلق الملك فانصرف الى الكامل وهو المملوك رقية ویداً فلا يجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض ولا على المولى في عبده المعد للتجارة اذا ابق لعدم اليد ولا المغضوب ولا المجحود اذا عاد الى صاحبه كذا في غاية البيان.

العبارة الثانية:- وقال في البدائع ووجوب الزكوة وظيفة الملك المطلق وعلى هذا يخرج قول ابي حنيفة في الدين الذي وجب للانسان لا بدلاً عن شئ رأساً كالميراث الدين والوصية بالدين او وجب بدلاً عما ليس بمال اصلاً كالمهر على الزوج وبدل الخلع للزوج على المرأة والصلح عن دم العمد انه لا تجب الزكوة فيه وجملة الكلام في الديون انها على ثلاث مراتب في قول ابي حنيفة دين قوى ودين ضعيف ودين وسط كذا قال عامة مشائخنا اما القوى فهو الذي وجب بدلاً عن مال التجارة ولا خلاف في وجوب الزكوة فيه الا انه لا يخاطب باداء شئ من زكوة ماضى مالم يقبض اربعين درهما ادى درهما واحد او عند ابي يوسف ومحمد كلما قبض شيئاً يودى زكوته قل المقبوض او كثر واما الضعيف فهو

الذى وجب له لا بدلاً عن شئ سواء وجب كاله بغير صنعه كالميراث او يصنعه كما بوصية او وجب بدلاً عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن القصاص وبدل الكتابة ولا زكوة فيه مالم يقبض كله ويحول عليه الحول بعد القبض واما الدين الوسط فما وجب له بدلاً عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه ذكر في الاصل انه تجب فيه الزكوة قبل القبض لكن لا يخاطب بالاداء مالم يقبض مائتي درهم فاذا قبض مائتي درهم زكى لما مضى وروى ابن سماعة عن ابي يوسف عن ابي حنيفة انه لا زكوة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو الصريح الروائين عنه.

وفي البدائع بعد ذلك ولا يبي حنيفة وجهان احدهما الدين ليس بمال بل هو فعل واجب وهو فعل تمليك المال وتسليمه الى صاحب الدين والزكوة انما تجب في المال فاذا لم يكن مالاً لا تجب فيه الزكوة ودليل كون الدين فعلاً من وجوه ذكرناها في الكفالة بالدين من ميت مفلس في الخلافات كان ينبغي ان لا تجب الزكوة في دين مالم يقبض ويحول عليه الحول الا ان ما وجب له بدلاً عن مال التجارة اعطى له حكم المال لان بدل الشئ قائم مقامه كانه هو نصار كان المبدل قائم في يده وانه مال التجارة وقد حال عليه الحول في يده والثاني ان كان الدين مالاً مملوكاً ايضاً لكنه مال لا يحتمل القبض لانه ليس

بمال حقيقة بل هو مال حكمي في الذمة وما في الذمة لا يمكن قبضة فلم يكن مالاً مملوكاً ايضاً لكنه مال لا يحتمل القبض لانه ليس بمال حقيقة بل هو مال حكمي في الذمة وما في الذمة لا يمكن قبضة فلم يكن مالاً مملوكاً رقة وبدلاً فلا تجب الزكوة فيه كمال الضمار فقياس هذا ان لا تجب الزكوة في الديون كلها نقصان الملك بقوات اليد الا ان الدين الذين هو بدل مال التجارة الحق بالعين في احتمال القبض لكونه بدل مال التجارة قابل للقبض، والبدل يقام مقام المبدل والمبدل عين قائمة قابلية للقبض فكذا ما يقوم مقامه وهذا المعنى لا يوجد فيما ليس ببدل رأساً ولا فيما هو بدل عما ليس بمال وكذا في بدل ما ليس للتجارة على الرواية الصحيحة انه لا تجب فيه الزكوة مالم يقبض قدر النصاب ويحول عليه الحول بعد القبض لان الثمن بدل مال ليس للتجارة فيقوم مقام المبدل ولو كان المبدل قائماً في يده حقيقة لا تجب الزكوة فيه فكذا في بدله بخلاف مال التجارة (بدائع ص ۱۰ ج ۲)

۶۔ اصل فنڈ سے حاصل شدہ مزید نفع کا حکم :-

یہ مزید نفع شرعاً سود کے حکم میں نہیں، بلکہ کارخانہ کی طرف سے ایک قسم کا انعام ہے جو ملازمین کو لینا اور اپنے استعمال میں لانا جائز ہے۔ اور اسکی زکوٰۃ کا حکم یہ ہے کہ اس کے وصول ہونے سے پہلے زمانہ کی زکوٰۃ

ملازم کے ذمہ صاحبین کے نزدیک بھی واجب نہیں، کیونکہ انعام جب تک وصول نہ ہو جائے وہ دین کی کسی بھی قسم میں داخل نہیں اور اس پر ملازم کی ملکیت نہ تام ہے ناقص، لہذا وصولی سے پہلے زمانہ کی زکوٰۃ اس پر واجب ہونے کے کوئی معنی نہیں، ہاں جب وصول ہونے کے بعد اس پر ایک سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ وصول شدہ انعام بقدر نصاب ہو یا ملازم کی ملکیت میں اتنا مال پہلے سے موجود ہو کہ انعام کے ساتھ مل کر وہ مقدار نصاب کو پہنچ جاتا ہو۔

اور اس مزید منافع کے بارے میں جو شبہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعض طریقے بظاہر سودی اور ناجائز معلوم ہوتے ہیں تو اسکی تفصیل یہ ہے کہ سوال میں نفع حاصل کرنے کے دو طریقے ذکر کئے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلے طریقہ کے جواز میں تو اشکال ہی نہیں اسلئے کہ کارخانہ سے باہر دیگر کمپنیوں کے حصص خرید کر ان کے نفع نقصان میں شریک ہونا ایک جائز تجارت ہے۔

البتہ دوسرے طریقہ میں اشکال ہو سکتا ہے کہ جب اصل فنڈ کو مالکان کارخانہ اپنے ہی کارخانہ میں لگائیں خواہ نفع ہو یا نقصان وہ اس پر نفع دینے کے بہر حال پابند ہیں یا تو بنک کی شرح سود سے ۲۱/۲ فیصد زائد نفع دیں یا کارخانہ کے حصہ داروں کو بقدر فیصد نفع تقسیم کریں اس کا ۵۷ فیصد نفع ملازمین کو دیں، اور یہ صورت بظاہر ناجائز معلوم ہوتی ہے کیونکہ اپنا روپیہ کسی کے کاروبار میں اس شرط پر لگانا کہ کاروبار میں نفع ہو یا نقصان میں بہر حال اتنا نفع لوں گا سودی معاملہ ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ اس وقت سودی اور ناجائز ہوتا ہے جب کہ ملازمین یا ان کے وکیل اصل فنڈ وصول کرنے کے بعد کارخانہ میں مذکورہ شرط پر لگاتے، مگر یہاں ایسا نہیں، بلکہ فنڈ کارخانہ ہی کے پاس رہتا ہے وہی از خود اسے اپنے کاروبار میں لگاتا ہے، لہذا یہاں سود کا معاملہ متحقق نہیں ہوا، کیونکہ سوال نمبر اس کے جواب

میں بتایا جا چکا ہے کہ اصل فنڈ ملازمین کی اجرت ہی کا حصہ ہے، اور سوال نمبر ۵ کے جواب میں یہ واضح ہو چکا کہ اجرت جب تک ملازم یا اس کا وکیل وصول نہ کر لے وہ اس کا حقدار تو ضرور ہے مالک نہیں (کما سیأتی مصرحاً عن البحر الرائق) بلکہ کارخانہ ہی اس کا مالک ہے اور جب کارخانہ ہی اسے اپنے کاروبار میں مذکورہ بالا شرط کے ساتھ لگاتا ہے تو یہ معاملہ کارخانہ اور ملازم کے مابین نہیں ہوا بلکہ خود کارخانہ نے اپنے ہی کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے اور اسکی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اپنے صندوق میں رکھے ہوئے روپے نکال کر اپنے کاروبار میں اس شرط پر لگائے کہ کاروبار میں نفع ہو یا نقصان میں ہر سال اس رقم پر اتنا سود نکال کر اس صندوق میں ڈالا کروں گا، تو ظاہر ہے کہ اس نے اس کا نام اگرچہ سود رکھا ہے اور معاملہ کی ظاہری صورت بھی سود کی سی بنائی ہے مگر حقیقتاً و شرعاً یہ معاملہ سودی نہیں، کیونکہ سود کا معاملہ کم از کم دو فریق کے درمیان ہوتا ہے اور یہاں فریقین کے درمیان لین دین سرے سے پایا ہی نہیں گیا۔

اجرت وصول ہونے سے قبل ملازم کی ملکیت میں نہ آنے کے بارے میں البحر الرائق کی مندرجہ ذیل عبارت اور زیادہ صریح ہے۔

(قوله: بالتعجيل او بشرطه او بالاستيفاء او بالتمكن) یعنی لا يملك الاجرة الا بواحد من هذه الاربعة والمراد انه لا يستحقها الا لمؤجر الا بذالك كما اشار اليه القدوري في مختصره، لانها لو كانت ديناً لا يقال انه ملكه المؤجر قبل قبضه واذا استحقها المؤجر قبل قبضها فله المطالبة بها وحبس المستأجر عليها وحبس العين عنه وله حق الفسخ ان لم يعجل له المستأجر كذا في المحيط لكن ليس له بيعها قبل قبضها۔ (بحر ۲۲۷ ج ۷)

خلاصہ یہ کہ کارخانہ اصل فنڈ پر جو منافع ملازمین کو ہر سال دے گا شرعاً وہ سود

نہیں بلکہ مستقل انعام ہے جو ملازمین کو لینا اور اپنے بارے استعمال میں لانا جائز ہے۔

والله اعلم بالصواب وهو المرجع والمآب ولا حول ولا قوة الا بالله العلي العظيم.

کتبہ العبد الفقیر

محمد رفیع عثمانی عماد اللہ عنہ

دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴

۳ صفر ۱۴۹۲ھ

مطابق ۲۰-۲۱-۲۰۰۷

الجواب صحیح

محمد یوسف بنوری

ولی حسن

بندہ محمد شفیع

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن

کمیٹی چند تجاویز

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے لئے چند تجاویز

مقتول از "اللاغ" شمارہ شوال ۱۳۹۳ھ

سوال: عوام کو مکان بنانے میں سہولت مہیا کرنے کے لئے گورنمنٹ نے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس کا نام ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن ہے۔ اس کا طریقہ کاریہ ہے کہ جب کوئی شخص زمین حاصل کر لیتا ہے اور اس زمین کا کرایہ نامہ (لیزڈیڈ) رجسٹرڈ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے خرچ سے تعمیر مکان شروع کر دیتا ہے تو اپنی ضرورت کے مطابق رقم کے قرضہ کے لئے اس کارپوریشن کو درخواست دیتا ہے۔ اس درخواست میں وہ زمین کی تفصیل، رقم جو زمین حاصل کرنے میں خرچ ہوئی اور ابتدائی تعمیر میں صرف کی بیان کرتا ہے ساتھ ہی اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنی زمین اور اس تعمیر کو جو اس پر مکمل ہوگی اس کارپوریشن کے پاس قرضہ کی ادائیگی کی ضمانت کے طور پر رہن رکھنے کے لئے تیار ہے۔

کارپوریشن تمام تفصیلات زمین، نقشہ، تعمیر وغیرہ کی جانچ پڑتال کے بعد یہ طے کرتی ہے کہ اس تعمیر کے مکمل ہونے میں کتنی مزید رقم کی ضرورت ہوگی اور اپنے تخمینے کے مطابق مناسب رقم کا قرضہ منظور کر لیتی ہے چنانچہ ایک رہن نامہ مابین فریقین تحریر میں آ جاتا ہے۔

منظور شدہ رقم کارپوریشن درخواست دہندہ کو چار اقساط میں ادا کرتی ہے۔ پہلی قسط رہن نامہ تحریر ہونے پر فوراً دیدی جاتی ہے۔ باقی اقساط تین تین ماہ کے وقفہ سے دی جاتی ہیں۔ دوسری قسط کے موقع پر درخواست کنندہ کارپوریشن کو تحریری طور پر یہ بتاتا ہے کہ پہلی قسط کی رقم پوری خرچ ہو گئی اور تعمیر میں کیا اضافہ ہوا۔ اس پر کارپوریشن کا انجینئر تعمیر کا معائنہ کرتا ہے، اور سرٹیفکیٹ دیتا ہے جس میں وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ تعمیر مذکور میں جو اضافہ ہوا ہے اس میں رقم مذکور ختم ہو گئی۔ اس کے بعد دوسری قسط کارپوریشن درخواست دہندہ کو دیدیا جاتا ہے اسی طور پر تیسری اور چوتھی قسط ادا کی جاتی ہے۔

رہن نامہ میں جہاں منظور شدہ قرضہ کی رقم بتائی جاتی ہے وہاں یہ بھی تحریر ہوتا ہے کہ اس رقم پر سود کس شرح فیصد سالانہ پر لگے گا۔ کتنے سال میں کتنا روپیہ ماہوار قسط کے حساب سے اس کو ادا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ دیگر شرائط کا بھی ذکر ہوتا ہے جن کا مقصد کارپوریشن کو ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے، ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ اس مکان کا بیمہ بھی درخواست دہندہ (مالک مکان) کی طرف سے کارپوریشن کرائیگی اور بیمہ کا خرچہ مالک مکان کے ذمہ ہوگا اور یہ کہ مالک مکان بیمہ کے پریمیم کی رقم ہر سال اس وقت تک ادا کرتا رہے گا جب تک قرضہ کی پوری رقم مع سود ادا ہو۔

چونکہ کارپوریشن کے اس طرح قرضہ دینے میں سود اور بیمہ وغیرہ شامل ہیں جو شرعاً حرام و ناجائز ہیں اس لئے سوچا گیا کہ کوئی صورت ایسی نکالی جائے جس میں مکان بنانے والے کی ضرورت بھی پوری ہو جائے اور وہ سود بیمہ وغیرہ میں ملوث بھی نہ ہو ساتھ ہی کارپوریشن کو بھی کسی قسم کا نقصان نہ رہے اور مالک مکان سے رقم کی ادائیگی بھی یقینی ہو جائے چنانچہ حسب ذیل تجویز کارپوریشن کو

پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

تجویز

جب کوئی شخص مکان بنوانے کے لئے کارپوریشن کی امداد کی ضرورت محسوس کرے تو زمین (پلاٹ) کے کرایہ نامہ (لیز نامہ) کے ساتھ وہ ایک درخواست کارپوریشن کو پیش کرے جس میں حسب ذیل تفصیلات مذکور ہوں۔

(۱) زمین کی تفصیلات اور وہ رقم جو زمین کے حاصل کرنے میں خرچ ہوگی۔

(۲) مکان کا مجوزہ نقشہ، اور کس حد تک تعمیر ہو چکی ہے اور اس پر کیا رقم خرچ ہوئی۔

(۳) یہ درخواست کی جائے کہ کارپوریشن مکان کی باقی تعمیر اپنی نگرانی میں اور اپنے صرفہ سے مکمل کرادے۔

(۴) یہ تحریر کیا جائے کہ مالک مکان کارپوریشن کی وہ رقم جو تعمیر کی تکمیل میں خرچ ہوگی مع دیگر اخراجات اور کارپوریشن کے منافع کے ادا کرنے کا ذمہ دار ہوگا اور ادائیگی مقررہ ماہوار اقساط میں معینہ مدت کے اندر پوری کر دے گا۔

(۵) ادائیگی کی ضمانت کے طور پر وہ اس مکان کو مع زمین کارپوریشن کی پاس رہن رکھے گا۔

درخواست موصول ہونے پر کارپوریشن مکان کے نقشہ کے مطابق خرچ کا تخمینہ تیار کرائے گی اس میں انشورنس وغیرہ کا خرچ اور منافع کی رقم شامل کرنے کے بعد درخواست دہندہ کو مطلع کرے گی کہ تعمیر کی تکمیل کے لئے اس کو کل

کتنی رقم ادا کرنی ہوگی، کتنی مدت میں ادا کرنی ہوگی اور ماہوار قسط کتنے روپیہ کی ہوگی اگر درخواست دہندہ وہ رقم مقررہ مدت اور اقساط میں ادا کرنے کی ذمہ داری لینے کو تیار ہو اور ادائیگی کی ضمانت میں زمین مع تعمیر رہن رکھے تو فریقین کے درمیان معاہدہ ہو جائے گا۔

(نوٹ) اس طریقہ میں کارپوریشن کو کسی ٹھیکیدار یا ہاؤسنگ سوسائٹی کے ذریعہ تعمیر مکمل کرانی ہوگی۔ ایسا پہلے ہو چکا ہے۔ کارپوریشن نے دستگیر کالونی میں کچھ کوارٹر ٹھیکہ دار کی ذریعہ (یا سوسائٹی سے) تعمیر کرانے کے بعد مالکان کو دے دیئے تھے۔ اس طرح پوری تعمیر کے لئے بھی یہ انتظام ہو سکتا ہے۔

براہ کرم مندرجہ بالا تجاویز کو اسلامی شریعت کے احکامات کی روشنی میں جانچا جائے۔ ان کے درست ہونے یا نہ ہونے پر فیصلہ فرمایا جائے یا ضروری زمینات کر کے درست فرمایا جائے۔

نیاز مند محمد ایوب انصاری نمبر ۴۱۳ پیر الہی بخش کالونی کراچی مورخہ ۹ جمادی الاول ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۱ جون ۱۹۷۳ء۔

الجواب

حامدا و مصلیا و مسلما

مذکورہ تجویز بنیادی طور پر شرعاً قابل عمل ہو سکتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ کارپوریشن پلاٹ کے مالک کی مذکورہ بالا درخواست کے جواب میں یہ معاملہ کرے کہ ہم باقی ماندہ تعمیر نقشہ کے مطابق مکمل کر کے آپ کو دیں گے مال اور مزدوری سب ہماری طرف سے ہوگی، سیمنٹ، لوہا، لکڑی وغیرہ تمام سامان جس جس قسم کا جتنا جتنا یا جس جس تناسب سے ملے گا سب ملے کر لیا جائے، ہر کام کی

نوعیت بھی طے کر لیں۔ (کافی العبارة الاولى) اور مجموعی تعمیر (مع مال و مزدوری) کی قیمت کارپوریشن اتنی لگائے جتنی اصل لاگت اور سود کے مجموعہ سے حاصل ہوئی۔ اور یہ قیمت جتنی مدت اور قسطوں میں ادا کرنی ہوگی وہ بھی طے کر لی جائے، اور پلاٹ اور اس پر جو تعمیر مالک نے اپنی تک کرائی تھی یہ دونوں چیزیں یا کوئی اور جائیداد یا زیور (جس پر کارپوریشن راضی ہو) کارپوریشن کو بطور رہن قبضہ میں دیدی جائے، اس طرح یہ معاملہ جائز ہو جائے گا، مگر جو حصہ کارپوریشن تعمیر کرے گی اسے رہن نہیں رکھا جاسکتا کیوں کہ محدود پر عقد رہن صحیح نہیں (کما فی العبارة الثانية) اور حصہ تعمیر کو رہن رکھنے کی ضرورت بھی کارپوریشن کو اسی لئے نہیں کہ رہن کے بغیر بھی کارپوریشن اس حصہ کو شرعاً اس وقف تک اپنے قبضے میں روکنے کی مجاز ہے جب تک کہ اس کو جملہ اقساط وصول نہ ہو جائیں۔

پلاٹ کے مالک اور کارپوریشن کے درمیان باقی ماندہ مکان تعمیر کرنے کا جو معاملہ ہوگا شرعی اصطلاح میں یہ ”استصناع“ ہوگا جو بالا جماع جائز ہے (کما فی العبارة الثالثة) یعنی کارپوریشن جتنا حصہ تعمیر کرے گی وہ بیع ہوگا اور اس کا عوض جو مالک مکان کے ذمے طے ہو وہ ثمن ہوگا (کما فی العبارة الرابعة)

اور یہ ثمن چونکہ واجب فی الذمہ ہوگا لہذا اس کے مقابلہ میں رہن رکھنا بھی صحیح ہوگا (کما فی العبارة الخامسة)

یاد رہے کہ رہن صحیح ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ جو چیز رہن رکھی جائے اس پر کارپوریشن کا یا کسی ثالث کا (جس پر دونوں فریق راضی ہوں) قبضہ کر دیا جائے، اگر مذکورہ بالا معاملہ میں یہ شرط رکھ دی گئی کہ پلاٹ اور اس کی

موجودہ تعمیر پر مالک ہی کا قبضہ رہے گا تو شرعاً یہ رہن صحیح نہ ہوگا اور فریقین میں سے کوئی بھی احکام رہن کا پابند نہ ہوگا، البتہ کارپوریشن یا ثالث کے قبضہ کے بعد اگر فریقین راضی ہوں تو پلاٹ اور موجودہ تعمیر شدہ حصہ مالک کے قبضہ میں واپس کیا جاسکتا ہے (کما فی العبارة السادسة) اور جب مالک کے قبضہ میں واپس آجائے تو مالک اسے اپنے استعمال میں بھی لاسکتا ہے۔ (کما فی العبارة السابعة)

متعلقہ عبارت فقہیہ درج ذیل ہیں:

(۱) واما شرائط جوازہ فمنہا بیان جنس المصنوع ونوعہ وقدرہ وصفہ لانه لا یصیر معلوماً بدونہ. (بدائع ص ۳ ج ۵)

(۲) واما الذی یرجع الی المرہون فانواع منہا ان یکون محلاً قابلاً للبیع وهو ان یکون موجوداً وقت العقد ملاً متقوماً، مملو کا معلوماً مقدور التسلیم ونحو ذلک فلا یجوز رهن مالیس بموجود عند العقد ولا رهن ما یحتمل الوجود والعدم کما اذا ارتهن ما یثمر نخیلہ العام (بدائع ص ۱۳۵ ج ۶)

(۳) ویجوز استحصاناً لاجماع الناس علی ذلک (الی قولہ) والقیاس یتروک بالاجماع (بدائع ص ۲۰۲ ج ۵)

(۴) واما حکم الاستصناع فهو ثبوت المملک للمستصنع فی العین المبیعة فی الذمۃ وثبوت المملک للصانع فی الثمن ملکاً غیر لازم (الی قولہ) واما صفة الاستصناع فہی انه عقد غیر لازم قبل العمل من

الجانبيين جميعا بلا خوف حتى كان لكل واحد منهما خيار الامتناع قبل العمل كالبيع المشروط فيه الخيار للمتبايعين لكل واحد منهما الفسخ (بدائع ص ٣ ج ٥)

(٥) يجب ان يعلم ان الرهن انما يصح بدين واجب او بدين وجد سبب وجوبه كالرهن بالاجر قبل وجوبه اما الرهن بدين لا يجب ولم يوجد سبب وجوبه كالرهن بالدرك لا يصح (عالمگیریه ص ٤٣٤ ج ٥)

وفي بدائع الصنائع اما الذي يرجع الى المرهون به فانواع منها ان يكون مضمونا (الى قوله) فاصل الضمان هو كون المرهون به مضمونا شرط جواز الرهن (الى قوله) ولسنا نعنى بالمضمون سوى ان يكون واجب التسليم على الراهن والمضمون نوعان دين وعين اما الدين فيجوز الرهن به باى سبب وجب من الاتلاف والغصب والبيع ونحوها الان الديون كلها واجبة على اختلاف اسباب وجوبها (الى قوله) فيصح وسواء كان مما يحتمل الاستبدال قبل القبض او لا يحتمله كراس مال السلم وبدل الصرف والمسلم فيه.

(بدائع الصنائع ص ١٤٢ ج ٦)

(٦) منها (اي من شرائط جواز الرهن) ان يكون (اي المرهون) مقبوض المرتهن او من يقوم مقامه (بدائع كتاب الرهن ص ١٣٧ ج ٦) ولو تعاقد اعلى ان يكون الرهن في يد صاحبه لا يجوز الرهن حتى لو هلك في يده لا يسقط الدين ولو اراد المرتهن ان يقبضه من يده ليحبسه رهنا ليس له ذلك لان هذا الشرط فاسد او غلاه في الرهن فلم

يصح الرهن ولو تعاقد اعلى ان يكون في يد العدل وقبضه العدل جاز ويكون قبضه كقبض المرتهن (الى قوله) وكذا اذا قبضه المرتهن او العدل ثم تراضيا على ان يكون في يد الراهن ووضع في يده جاز لان القبض الصحيح للعقد قد وجد وقد خرج الرهن من يده وبعد ذلك يده ويد الاجنبي سواء (بدائع ص ١٣٧ ج ٦)

(٧) فاما حق حبس المرهون فليس بحكم لازم حتى ان المرهون ان كان شيئا يمكن الانتفاع به بدون استهلاكه كان للراهن ان يسترده من يد المرتهن فينتفع به فاذا فرغ من الانتفاع رده اليه (بدائع ص ١٤٠ ج ٦) والله اعلم

الجواب صحيح:

بنده محمد شفيق عفا الله عنه

١٥/٤/٩٣٠ هـ

كاتبه: محمد رفيع عثمانى عفا الله عنه

دار الافتاء دار العلوم كراچی نمبر ١٢

٥/٤/٩٣١ هـ

امریکہ میں انشورنس کی ایک جائز صورت

امریکہ میں انشورنس کی ایک جائز صورت

منقول از ماہنامہ "البلد" شمارہ نمبر ۱۰۱ اولیٰ ۱۳۵۵ھ

کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ :
میڈیکل انشورنس یہاں پر کچھ اس طرح سے شروع ہوئی ہے کہ کسی آفس
کے چند لوگ باری باری بیمار ہوئے جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی مالی حالت
بدتر ہو گئی، اس کے بعد ایک شخص اتنا بیمار ہوا کہ اس کے پاس علاج کے پیسے بھی
نہ تھے اس پر اس کے ایک قریبی دوست و احباب نے کچھ رقم جمع کی جس کی وجہ
سے اس کا علاج ہو سکا، اس طرح اس کے دوست و احباب نے جو کہ ساتھ ملازم
تھے باقاعدہ ایک فنڈ قائم کیا کہ ہر شخص ہر تنخواہ پر چند روپے فنڈ میں جمع کروائے
اور پھر بوقت ضرورت ہر ممبر کے علاج کے موقع پر اسے مالی امداد مہیا کرے،
اس طرح سے ممبر لوگوں کو بیماری کے وقت علاج کے لئے فنڈ سے پیسے مل جاتے
تھے اسی طرح رفتہ رفتہ باہر کے لوگ بھی اس فنڈ میں پیسے جمع کروانے لگے اور
بہت سے لوگ اس سے فائدہ اٹھانے لگے اور آج پورے امریکہ میں یہ رواج
انشورنس عام ہے اور بڑے بڑے لوگ بغیر تنخواہ کے اس کا روبرو کو چلا رہے ہیں
یہ میڈیکل انشورنس تجارتی طور پر کوئی اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتا۔

اگر اس فنڈ میں سے زیادہ بیمار ممبروں پر صرف ہوتا ہے تو تمام ممبروں کے

لئے فیس بڑھا دیتے ہیں اور اگر کم ہوتا ہے تو فیس بھی کم دینا پڑتی ہے اگر یہ
صورت ناجائز ہے تو اس کا بدل کیا ہو سکتا ہے۔

محمد سمیع

۵ ربیٰ روکی ہل

کلونیل ڈرائیو۔ امریکہ

الجواب

میڈیکل انشورنس کی جو تفصیل سوال میں بیان کی گئی ہے، چونکہ اس کے
کسی مرحلہ میں سود یا قمار نہیں ہے اور بھی کوئی چیز مخالف شریعت نہیں اس لئے
امداد باہمی کی یہ صورت بلا کراہت جائز بلکہ مستحب ہے۔

علماء کرام کی طرف سے انشورنس اور امداد باہمی کی جو جائز صورتیں مختلف
مواقع پر تجویز کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے، مگر افسوس کہ مسلمان
ملکوں میں اس طرف توجہ نہیں دی گئی، کاش ان کو بھی توفیق ہو وہ انشورنس کی
راجح الوقت حرام صورتوں کو چھوڑ کر جائز صورتیں اختیار کر لیں۔ واللہ اعلم۔

کتبہ محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

نائب مفتی دارالعلوم کراچی نمبر ۱۳

۱۳/۴/۱۳۵۵ھ

اسلامی سوشلزم؟

اسلامی سوشلزم؟

منقول از البلاغ: شوال ۱۳۸۸ھ

سوال: براہ کرم اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر تبصرہ فرمائیے
(سائل کا نام نہیں پڑھا گیا ولد ابا حسین، نکری گراؤنڈ کراچی)

جواب: اس اصطلاح کو استعمال کرنے والوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد کو مانتے ہوئے اگر سوشلزم کا صرف اقتصادی نظام اپنایا جائے تو اسے ”اسلامی سوشلزم“ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اس خیال کی بنیاد اس غلط فہمی پر ہے کہ چونکہ سوشلزم بھی مساوات کا دعویٰ کرتا ہے اور اسلام بھی مساوات کا مذہب ہے، لہذا اسلام اور سوشلزم کا اختلاف صرف عقیدے کی حد تک تو ہے کہ سوشلزم خدا اور رسول اور یوم آخرت کا منکر ہے اور اسلام کا سب سے پہلا سبق انہی تین چیزوں کا عقیدہ ہے۔ رہا اقتصادی اور معاشی نظام تو اس میں اسلام اور سوشلزم کا کوئی اختلاف نہیں، لہذا اگر عقائد تو اسلام کے اور اقتصادی نظام اشتراکیت کا اپنایا جائے تو اس سے اسلام کے مقاصد پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی اور سوشلزم ”مشرق بہ اسلام“ ہو جائے گا۔

یہ نعرہ اگر کسی غیر ملکی سازش کا ترجمان نہیں تو بلاشبہ یہ اس مرعوب ذہنیت اور اسلام سے کھلی نادانیت کی پیداوار ضرور ہے جسے برصغیر کے ڈیڑھ سو سالہ دور غلامی نے جنم دیا ہے۔

ورنہ یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی تو نہیں ہے کہ سوشلزم کا اقتصادی نظام اسلام کے اقتصادی نظام سے بنیادی طور پر مختلف ہے یہ اقتصادیات کے بالکل الگ الگ دو نظام ہیں جن میں مطابقت کا کوئی امکان نہیں۔

سوشلزم جس مساوات کا مدعی ہے وہ نہ تو اسلام کا مقصود ہے، نہ اسلام اس کو صحیح سمجھتا ہے، سوشلزم معاشی مساوات کا مدعی ہے، جبکہ اسلام معاشی کے بجائے معاشرتی اور قانونی مساوات کا مدعی ہے۔ البتہ معاشیات میں اسلام توازن اور اعتدال کا ضامن ضرور ہے کہ اس میں کسی امیر کو غریب کا خون چوسنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔

اسی طرح سوشلزم درحقیقت نظام سرمایہ داری کی چیرہ دستیوں کا جذباتی رد عمل ہے اور خود اتنا ہی سفاک سبے رحم اور خطرناک ہے جتنا سرمایہ دارانہ نظام۔ سرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں کے خون چوسنے کا جو ظالمانہ کھیل کھیلا جاتا ہے اس سے متاثر ہو کر سوشلزم کے جذباتی ناخداؤں نے انفرادی ملکیت کا سرسے سے انکار کر دیا، لیکن سوشلسٹ ممالک کی تاریخ اور موجودہ حالات شاہد ہیں کہ وہاں انفرادی ملکیت کے خاتمے سے اس کے سوا کچھ نہ ہو سکا کہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو گئے اور ان کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار اسٹیٹ کے نام سے وجود میں آ گیا جو سرمایہ کے پورے ذخیرہ پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے۔ رہا بیچارہ مزدور تو سوشلزم میں اس کی مظلومیت اور بڑھ گئی کہ یہاں اس کو یہ کہہ کر بیوقوف بنایا جاتا ہے کہ ہم نے تیرے درد کا درمان کر دیا ہے لہذا تجھے کراہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔

اسلام کے نزدیک سرمایہ داری کی درندگی کا علاج انفرادی ملکیت کا خاتمہ

نہیں بلکہ انفرادی ملکیت کی خود غرضی، بے لگامی، اور غیر متوازن قوت کو ختم کرنا ہے، چنانچہ اسلام نے انفرادی ملکیت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ محترم قرار دیا ہے، لیکن سود، قمار، سٹہ، احتکار، بیع الحاضر للبادی اور تعلق الجلب کی حرمت اور زکوٰۃ، صدقات، نفقات، کفارات، عشر و خراج، وراثت، وصیت، وقف اور ہبہ کے مفصل احکام کے ذریعہ اس نے اس ملکیت کو اتنا پابند کر دیا ہے کہ مالدار کو کسی حال بھی غریب کا خون اور پسینے سے کھینے کا موقع نہیں ملتا۔

خلاصہ یہ کہ سوشلزم کے اقتصادی نظام کی بنیاد جس نظریہ پر قائم ہے، اسلام اس بنیاد ہی کو سرے سے تسلیم نہیں کرتا۔ پھر ان میں مصالحت کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے؟

اس سے واضح ہو گیا کہ ”اسلامی سوشلزم“ کی اصطلاح ایسی ہی مضحکہ خیز اور شرمناک ہے جیسے کوئی شخص برائڈی کی بوتل پر زرمز کا لیبل لگا کر دوسروں کو بیوقوف اور خود کو پارہ سا سمجھنے لگے۔ جس طرح عیسائیت، یہودیت، اور ہندومت کبھی اسلامی نہیں ہو سکتی، اس طرح نہ سوشلزم کبھی اسلامی ہو سکتا ہے اور نہ اسلام کبھی اشتراکی بن سکتا ہے۔ جس طرح اسلام کے نظام عبادات میں کسی دوسرے مذہب کی عبادات کا پیوند نہیں لگ سکتا، اسی طرح اس کے اقتصادی نظام میں بھی سرمایہ داری یا اشتراکیت کی پیوند کاری اسلام کے رہتے ہوئے ممکن نہیں۔

سوشلزم تو ابھی پچاس برس کی پیدوار ہے جس کا ابھی پورا تجربہ بھی کسی اشتراکی ملک میں نہیں ہو سکا۔ مگر اسلام کا اقتصادی نظام سینکڑوں برس تک مہذب دنیا میں کامیابی اور معتدل مساوات کے ساتھ رائج رہ چکا ہے اور جب تک مسلمانوں نے اسے اپنے بازاروں پر حکمران بنائے رکھا وہ دنیا کے دلوں پر

حکومت کرتے رہے۔

پھر اسلام کو آخر کیا ضرورت پڑی کہ وہ اپنی اقتصادیات کے لئے اشتراکیت کے جذباتی نظام کی یا سرمایہ داری کے عیارانہ نظام کی بھیک مانگتا پھرے۔

یاد رکھئے! اگر بنی نوع انسان کی تقدیر میں پھر زندگی کی خوشحالیوں اور مسرتیں لکھی ہیں تو وہ صرف قرآن و سنت ہی کے اقتصادی نظام میں ملیں گی۔ داس کیپٹل (DAS CAPITAL) میں انہیں تلاش کرنا بد نصیبی اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

عورتوں کی سربراہی کا مسئلہ

عورت کی سربراہی کا مسئلہ

پاکستانی قومی اسمبلی کے ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں نسوانی قیادت نے غیر متوقع طور پر کامیابی حاصل کر لی اور اچانک یہ سوال اٹھا کہ عورت آیا شرعاً حکمران بن سکتی ہے یا نہیں؟

اس سوال کا حضرت مفتی مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ مدلل جواب تحریر فرمایا جو روزنامہ ”جنگ“ کراچی کے علاوہ ماہنامہ ”البلارغ“ میں بھی شائع ہوا، مفتیان کبار کی تصدیقات اس پر ثبت ہیں۔

قرآن سنت کے واضح ارشادات کی بناء پر یہ بات چودہ سو سال سے فقہاء امت میں مسلمہ اور غیر متنازعہ چلی آئی ہے کہ کسی اسلامی حکومت میں سربراہی کے منصب کی ذمہ داریاں کسی خاتون کو سونپی جاسکتیں۔ علامہ ابن حزمؒ نے ”مراتب الایمان“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ان مسائل کو جمع فرمایا جن پر امت کا اجماع اور اتفاق رہا ہے اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

و اتفقوا أن الإمامة لا تجوز لامرأة^(۱)

”اس بات پر تمام علماء متفق ہیں کہ حکومت کی سربراہی کا منصب کسی عورت کے لئے جائز نہیں“

(۱) مراتب الایمان ص ۱۲۶

اس اجماع کی بنیاد قرآن و سنت کے بہت سے دلائل پر ہے جنہیں ہم صراحت کی ترتیب سے ذیل میں پیش کرتے ہیں:

(۱) صحیح بخاری وغیرہ میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد متعدد صحیح سندوں سے مروی ہے:-

لن يفلح قوم ولو امرهم امرأة^(۱)

”وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسے گی جو اپنے معاملات کی ذمہ داری کسی عورت کے سپرد کر دے“

اس حدیث میں یہ بھی صراحت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی تھی جب ایران کے باشندوں نے ایک عورت کو اپنا سربراہ بنالیا تھا، لہذا یہ حدیث عورت کو سربراہ بنانے کے عدم جواز پر واضح دلیل ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إذا كانت أمراؤكم خياركم وأغنياؤكم سمحاًؤكم
وأموركم شوری بينكم فظهر الأرض خير لكم من بطنها،
وإذا كانت أمراؤكم شراركم وأغنياؤكم بخلاًؤكم و
أموركم إلى نساؤكم فبطن الأرض خير لكم من ظهرها^(۲)
جب تمہارے امراء تم میں بہترین لوگ ہوں، اور تمہارے دولت مند لوگ تم میں سے نخی لوگ ہوں، اور تمہارے معاملات باہنی مشورے سے ملے ہوتے ہوں تو زمین کی پشت تمہارے لئے اس کے پیٹ سے بہتر ہے، اور جب تمہارے امراء تم میں بدترین لوگ ہوں،

(۱) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی ﷺ إلى حمیری و قیسر، حدیث ۴۴۲۵، و کتاب الفتن، باب الفتنة التي تموج كموج البحر، حدیث ۷۰۹۹،

(۲) جامع الترمذی، ابواب الفتن ص ۵۲ ج ۲.

تمہارے دولت مند تم میں بخیل لوگ ہوں، اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پشت سے بہتر ہوگا۔

یہ حدیث بھی اس قدر واضح ہے کہ اس کی کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ (۳) حضرت ابو بکرؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک لشکر کہیں بھیجا تھا، وہاں سے کوئی شخص فتح کی خوشخبری لیکر آیا، آپ ﷺ فتح کی خوشخبری سن کر سجدے میں گر گئے، اور سجدے کے بعد پیغام لانے والے سے تفصیلات معلوم کرنے لگے، اس نے تفصیلات بیان کیں:-

فَكَانَ فِيمَا حَدَّثَهُ مِنْ أَمْرِ الْعَدُوِّ وَكَانَتْ تَلِيهِمْ إِمْرَاءُ، فَقَالَ

النَّبِيُّ ﷺ: هَلَكْتَ الرِّجَالُ حِينَ أَطَاعَتِ النِّسَاءُ (۱)

ان تفصیلات میں اس نے دشمن کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ ان کی سربراہی ایک عورت کر رہی تھی، آنحضرت ﷺ نے یہ سن کر

فرمایا:

”جب مرد عورتوں کی اطاعت کرنے لگیں تو وہ تباہ و برباد ہیں“

اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح الاسناد قرار دیا ہے، اور حافظ ذہبی نے بھی اس کو صحیح کہا ہے۔

(۴) قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى

بَعْضٍ﴾ (سورة النساء)

”مرد عورتوں پر قوام (مگر ان، حاکم) ہیں بوجہ اس فضیلت کے جو اللہ

(۱) مستدرک الحاکم ص ۲۹۱ ج ۴، کتاب الأدب، باب سجدة الشک.

نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر دی ہے“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر قوامیت کا مقام مرد کو دیا ہے۔ اگرچہ براہ راست یہ آیت خانگی امور سے متعلق معلوم ہوتی ہے، لیکن اول تو آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو اس کو خانگی امور کے ساتھ خاص کرتا ہو، دوسرے یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جس صنف کو اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے سے گھر کی سربراہی نہیں سونپی، اس کو تمام گھروں کے مجموعے اور پورے ملک کی سربراہی کی ذمہ داری کیسے سونپی جاسکتی ہے؟

لہذا یہ آیت اگر عبارت النص کے طور پر نہیں، تو دلالت النص کے طور پر یقیناً اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کو کسی اسلامی ملک کا سربراہ نہیں بنایا جاسکتا۔

(۵) سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے عورت کا دائرہ عمل واضح طور سے بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾

”اور اپنے گھروں میں قرار رکھو، اور کچھیل جاہلیت کی طرح

بن سنور کر باہر نہ جاؤ“

اس آیت میں واضح طور سے بتا دیا گیا ہے کہ عورت کی اصل ذمہ داری اس کے گھر کی ذمہ داری ہے، اسے باہر کی جدوجہد سے یکسو ہو کر اپنے گھر کی اصلاح اور اپنے گھرانے کی تربیت کا فریضہ انجام دینا چاہیے جو درحقیقت پوری قوم اور معاشرے کی بنیاد ہے۔ لہذا گھر سے باہر کی کوئی ذمہ داری (استثنائی حالات کو چھوڑ کر) بحیثیت اصول کسی عورت پر نہیں سونپی جاسکتی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ خطاب خاص طور سے آنحضرت ﷺ کی

ازواج مطہرات کے لئے ہوا تھا، ہر عورت اس کی مخاطب نہیں ہے لیکن یہ بات اس قدر بدیہی طور پر غلط ہے کہ اس کی تردید کیلئے کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں۔

اول تو قرآن کریم نے اس جگہ ازواج مطہرات کو خطاب فرماتے ہوئے بہت سی باتوں کی تاکید فرمائی ہے، مثلاً یہ کہ وہ تقویٰ اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، فحش باتوں سے بچیں وغیرہ وغیرہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں کوئی ہوش مندیہ کہہ سکے کہ یہ حکم صرف ازواج مطہرات کے لئے ہے، کسی دوسری عورت کے لئے نہیں ہے، جب یہ سارے احکام تمام عورتوں کے لئے ہیں تو گھر میں قرار سے رہنے کا یہ ایک حکم بھی ازواج مطہرات کے ساتھ کیوں مخصوص ہے۔

دوسرے، اس بات میں کون مسلمان شک کر سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات اپنی علمی اور عملی صلاحیتوں کے لحاظ سے امت کی افضل ترین خواتین تھیں اور پوری امت کی مائیں تھیں اگر اسلام میں سیاست و حکومت اور معیشت و اقتصاد کی ذمہ داری کسی خاتون کو سونپنا جائز ہو تا تو ان مقدس خواتین سے زیادہ کوئی خاتون اس ذمہ داری کے لئے مناسب نہیں ہو سکتی تھی، جب قرآن کریم نے ان کو ایسی ذمہ داریاں لینے سے منع کر کے انہیں صرف گھر کی حد تک محدود رہنے کا حکم دیا تو پھر کون عورت ایسی ہو سکتی ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ جس وجہ سے ازواج مطہرات کو گھر میں قرار سے رہنے کا حکم دیا گیا تھا، وہ وجہ اس میں موجود نہیں ہے۔

(۶) سورہ احزاب میں قرآن کریم نے جو عورت کا دائرہ کار بیان فرمایا ہے، اس کی تشریح سرکارِ دو عالم ﷺ نے ایک حدیث میں اس طرح فرمائی ہے:-

والمرأة راعية على أهل بيت زوجها وولده، و هي مسئلة عنهم^(۱)

”اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد پر نگرانہ ہے اور وہی اس کی ذمہ دار ہے“

اس حدیث میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ عورت کی ذمہ داری گھر کے نظام کی دیکھ بھال، اولاد کی تربیت اور خانگی امور کا انتظام ہے، اسکو گھر سے باہر کی کوئی ذمہ داری نہیں سونپی گئی۔

(۷) اسلام میں ”حکومت کی سربراہی اور نماز کی امامت“ دونوں اس درجہ لازم و ملزوم ہیں کہ ”حکومت کی سربراہی“ کو شریعت کی اصطلاح میں ”امامت“ ہی کہا جاتا ہے اور ”امام“ کا لفظ جس طرح نماز پڑھانے والے کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی طرح ”سربراہ حکومت“ کو بھی ”امام“ کہا جاتا ہے، قرآن وحدیث میں بہت سے مقامات پر سربراہ حکومت کو اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور فقہاء کرام ”امامت“ کے دونوں معنی میں اس طرح فرق کرتے ہیں کہ نماز کی امامت کو امامت صغریٰ (چھوٹی امامت) اور حکومت کی سربراہی کو امامت کبریٰ (بڑی امامت) کہتے ہیں۔

ادھر یہ بات سٹے شدہ ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ عورت نماز میں مردوں کی امامت نہیں کر سکتی، جب اللہ تعالیٰ نے اس کو چھوٹے درجے کی امامت کی ذمہ داری نہیں سونپی تو بڑے درجے کی امامت اس کو کیسے سونپی جاسکتی ہے؟

اسلام میں نماز کا حکومت کی سربراہی سے کس قدر گہرا تعلق ہے؟ اس کا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب ۱، حدیث نمبر ۷۱۳۸، و کتاب الجمع، باب الجمع فی القری والدن، حدیث نمبر ۸۹۳، مزید دیکھئے حدیث نمبر ۲۴۰۹، ۲۴۰۵، ۲۴۰۴، ۲۴۰۳، ۲۴۰۲، ۲۴۰۱، ۵۱۸۸، ۵۲۰۰۔

اندازہ چند مندرجہ ذیل امور سے لگایا جاسکتا ہے:-

(الف) زمین کے کسی حصے پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد مسلمان حکمران کا سب سے پہلا فریضہ ”اقامتِ صلوٰۃ“ کو قرار دیا گیا ہے ارشاد ہے:-

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

”وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں“

(ب) آنحضرت ﷺ سے لے کر خلفائے راشدین تک، بلکہ اس کے بعد بھی صدیوں تک یہ متواتر عمل جاری رہا ہے کہ جس مجمع میں سربراہ حکومت موجود ہو اس میں نماز کی امامت وہی کرتا تھا۔ چنانچہ تمام مکاتب فکر کے فقہاء اس پر متفق ہیں کہ نماز کی امامت کا سب سے پہلا حق مسلمان سربراہ حکومت کو پہنچتا ہے اور جب آنحضرت ﷺ مرض وفات کی وجہ سے مسجد میں آنے سے معذور ہو گئے تو آپ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو اپنی جگہ نماز کی امامت کیلئے مقرر فرمایا اور اس سے صحابہ کرامؓ نے یہی سمجھا کہ ان کو ”امامت صغریٰ“ سپرد کر کے اشارہ اس طرف ہے کہ آپ کے بعد ”امامت کبریٰ“ یعنی حکومت کی سربراہی کیلئے بھی سب سے زیادہ اہل حضرت صدیق اکبرؓ ہیں، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

”ما غضبنا إلا لأنا قد أخرنا عن المشاورة وإنا نرى أبا بكر أحق الناس بها بعد رسول الله ﷺ، وإنه لصاحب الغار، وثاني اثنين، وإنا نعلم بشرفه وكبره، ولقد أمره رسول الله ﷺ بالصلوة بالناس وهو حي“ (۱)

ہماری ناگواری کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمیں مشورے میں شریک

(۱) مستدرک الحاکم ص ۶۶ ج ۳ و قال: صحيح على شرط الشيخين، وقره الذهبي.

نہیں کیا گیا، ورنہ ہم ابو بکرؓ کو رسول اللہ ﷺ کے بعد سربراہی کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں، وہ آپ کے غار کے ساتھی، دو میں سے دوسرے ہیں، ہم ان کے شرف اور عظمت سے واقف ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی زندگی میں ان کو نماز کی امامت کا حکم دیا تھا“

(ج) سربراہ حکومت کے لئے امامت نماز کا استحقاق شریعت میں اس درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ نماز جنازہ کی امامت میں سربراہ حکومت کو مرنے والے کے ورثاء پر بھی فوقیت دی گئی ہے اور یہ بات سطلے شدہ ہے کہ اگر نماز جنازہ میں سربراہ حکومت موجود ہو تو نماز کی امامت کا پہلا حق اس کا ہے اس کے بعد ورثاء کا۔ ان تمام احکام سے یہ بات واضح ہے کہ اسلام میں حکومت کی سربراہی کے ساتھ نماز کی امامت کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ اسلام میں کسی ایسے سربراہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا جو کسی بھی حالت میں امامت نماز کا اہل نہ ہو، اور عورت خواہ تقویٰ اور طہارت کے کتنے بلند مقام پر فائز ہو چونکہ نماز میں مردوں کی امامت نہیں کر سکتی اس لئے اس کو امامت کبریٰ یا حکومت کی سربراہی کی ذمہ داری بھی نہیں سونپی جاسکتی۔

(۸) اسلام کے تمام احکام میں یہ بات قدر مشترک ہے کہ واضح طور پر نظر آتی ہے کہ عورت کو ایک ایسی متاع پوشیدہ قرار دیا گیا ہے جس کا بلا ضرورت مجمع عام میں آنا کسی بھی حالت میں پسند نہیں کیا گیا ہے، سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

المرأة عورة، فإذا خرجت استشرفها الشيطان (۱)

”عورت پوشیدہ چیز ہے، چنانچہ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک میں لگ جاتا ہے“

(۱) جامع الترمذی۔ ابواب النکاح، حدیث نمبر ۱۱۸۳

اس لئے عورت کو پردے کا حکم دیا گیا ہے اور عام مسلمانوں کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ﴾^(۱)

”اور جب تم ان سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو“

اسلام کے وہ بہت سے احکام و شعائر جن کی بجا آوری گھر سے باہر نکلنے پر موقوف ہے ان سے خواتین کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، مثلاً جمعہ کی نماز کتنی فضیلت کی چیز ہے اور مردوں کو اس میں شامل ہونے کی کس قدر تاکید قرآن و حدیث میں آئی ہے، لیکن ساتھ ہی آنحضرت ﷺ نے یہ فرمادیا کہ:

الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة إلا أربعة: عبد

مملوك أو امرأة أو صبي أو مريض^(۲)

”جمعہ ایک ایسا فریضہ ہے جس کو جماعت کے ساتھ انجام دینا ہر

مسلمان پر واجب ہے سوائے چار آدمیوں کے: ایک غلام جو کسی کے

زیر ملکیت ہو، دوسرے عورت، تیسرے بچہ، چوتھے بیمار“

اس حدیث میں جمعہ جیسے اسلامی شعار سے عورت کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

اس طرح عام حالات میں ہر مسلمان کا یہ حق بتایا گیا ہے کہ اس کے انتقال

کے موقع پر دوسرے مسلمان اس کے جنازے کے ساتھ قبرستان تک جائیں

لیکن خواتین کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں:

(۱) سورة الاحزاب۔

(۲) سنن ابی داؤد، باب الجمعة للمملوك والمرأة حدیث نمبر ۱۰۶۷

نہیں عن اتباع الجنائز^(۱)

”ہمیں جنازوں کے پیچھے چلنے سے منع کیا گیا“

اس طرح عورت کو تنہا سفر کرنے سے منع کیا گیا اور تاکید کی گئی کہ وہ کسی محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

لا يحل لامرأة تؤمن بالله واليوم الآخر أن تسافر سفرا يكون

ثلاثة أيام فصاعداً، إلا ومعها أبوها أو أخوها أو زوجها أو

ابنها أو ذو محرم منها^(۲)

”جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو اس کے لئے حلال

نہیں کہ وہ تین دن (کی مسافت کا) یا اس سے زائد کا کوئی سفر کرے الا

یہ کہ اس کا باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کوئی اور محرم اس کے ساتھ ہو“

یہاں تک کہ حج جیسا مقدس فریضہ جو اسلام کے چار ارکان میں سے ایک

ہے، اس کی ادائیگی کے لئے بھی محرم کا ساتھ ہونا شرط ہے، اور عورت کا تنہا سفر

حج پر جانا کسی کے نزدیک جائز نہیں، ایسی صورت میں اس پر سے حج کی ادائیگی

ساقط ہو جاتی ہے۔ مرنے وقت تک ایسا محرم نہ ملے تو حج نہ کرے البتہ حج بدل کی

وصیت کر جائے۔

جہاد اسلام کے ارکان میں سے کتنا اہم رکن ہے؟ اور اس کے فضائل سے

قرآن و حدیث بھرے ہوئے ہیں، لیکن چونکہ یہ گھر سے باہر کا کام ہے اس لئے

جہاد کا فریضہ بھی خواتین سے ساقط کر دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد

(۱) صحیح البخاری ص ۱۷۰ ج ۱، باب اتباع الجنائز

(۲) جامع الترمذی، کتاب النکاح، باب کراهية ان تسافر المرأة وحدها، حدیث نمبر

بعض احادیث میں مروی ہے:

ليس على النساء غزو، ولا جمعة ولا تشيع جنازة^(۱)

”عورتوں پر نہ جہاد فرض ہے، نہ جمعہ، نہ جنازہ کے پیچھے جانا“

یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہؓ نے جہاد کے شوق کی وجہ سے آنحضرت ﷺ سے یہ سوال فرمایا کہ:

يعزرو الرجال، ولا تغزو النساء

”مرد جہاد کرتے ہیں، عورتیں جہاد نہیں کرتیں؟“

اس پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾

”اور ان چیزوں کی تمنا نہ کرو جن میں سے اللہ تعالیٰ نے تم میں سے

بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے“^(۲)

یہ واضح رہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بعض خواتین جہاد میں زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ کیلئے ساتھ گئی ہیں، لیکن کہنا یہ ہے کہ اول تو ان پر جہاد باقاعدہ فرض نہیں کیا گیا، دوسرے ان کو باقاعدہ لڑائی میں شامل نہیں کیا گیا۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

وقد كان يغزو يهن، فيداوين الجرحى، ويحذین من

الغنیمۃ، واما بسهم فلم يضرب لهن^(۳)

”آنحضرت ﷺ عورتوں کو جہاد میں لے جاتے اور وہ زخموں کا علاج

کرتیں اور انہیں مال غنیمت میں سے کچھ بطور انعام دیا جاتا، لیکن آپ

(۱) مجمع الزوائد ص ۷۰ ج ۲ بحوالہ طبرانی وفیہ تہذیب، الفتح الکبیر للنبہانی ص ۶۱ ج ۳،

(۲) جامع الترمذی، کتاب التفسیر، سورۃ النساء، حدیث نمبر ۵۰۱۱ و مسند احمد ص ۳۲۲ ج ۶

(۳) صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب النساء الغزایات، حدیث نمبر ۳۳۳۸۔

نے ان کے لئے مال غنیمت کا باقاعدہ حصہ نہیں لگایا“

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانے میں اگرچہ خواتین کو رات کے وقت مسجد نبویؐ میں آکر باجماعت نماز پڑھنے کی اجازت دی تھی، لیکن اس اجازت کے ساتھ ہی یہ فرمادیا تھا کہ:

و بیو تهن خیر لهن^(۱)

”اور ان کے گھر ان کے لئے بہتر ہیں“

جس کا واضح مطلب ہے کہ عورتوں کیلئے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے، جبکہ مردوں کیلئے سخت عذر کے بغیر مسجد میں جماعت ترک کرنا جائز نہیں، بلکہ عورتوں کے بارے میں یہاں تک فرمایا کہ:

صلاة المرأة فی بیتها أفضل من صلاحها فی حجرتها،

وصلاتها فی مخدعها أفضل من صلاحها فی بیتها^(۲)

”عورت کا کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں نماز پڑھنے سے بہتر

ہے، اور اندرونی کمرے میں نماز پڑھنا بیرونی کمرے میں نماز پڑھنے

سے بہتر ہے“

ان احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ:

(۱) عورت پر جمعہ واجب نہیں۔

(ب) عورت کیلئے بغیر محرم کے سفر جائز نہیں۔

(ج) عورت پر تنہا ہونے کی صورت میں حج کی ادائیگی فرض نہیں، مرستے

دم تک محرم نہ ملے تو حج بدل کی وصیت کرے۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، باب خروج النساء الی المساجد، حدیث نمبر ۵۲۷، ۵۲۸۔

(۲) سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۵۷۰۔

(د) عورت پر جہاد فرض نہیں۔

(ه) عورت کے ذمے جماعت سے نماز پڑھنا واجب نہیں۔

(و) عورت کا گھر میں تنہا نماز پڑھنا باہر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے

افضل ہے۔

اب غور کرنے کی بات ہے کہ جس دین نے عورت کے تقدس اور اس کی حرمت کی حفاظت کیلئے جگہ جگہ اتنا اہتمام کیا ہے کہ اس کے لئے دین کے اہم ترین ارکان اور شعائر کو بھی اس کے حق میں ساقط کر دیا ہے، اس کے بارے میں یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ ملک و قوم کی اہم ترین ذمہ داری عورت کو سونپ کر اسے نہ صرف پورے ملک بلکہ پوری دنیا کے سامنے لاکھڑا کرے، اور اسے وہ تمام کام اجتماعی طور پر سونپ دے گا جن کی ذمہ داری اس پر انفرادی طور سے بھی عائد نہیں ہوتی۔

نبی کریم سرور دو عالم ﷺ کے عہد مبارک سے لیکر خلافت راشدہ بلکہ خلافت راشدہ کے بعد بھی صدیوں تک خلیفہ اور سربراہ حکومت کا انتخاب امت کا اہم ترین سیاسی مسئلہ بنا رہا، ایک خلیفہ کے بعد دوسرے خلیفہ کے انتخاب کے وقت ہر موقع پر بہت سی تجویزیں سامنے آئیں، اس دور میں نبی شمار ایسی خواتین موجود تھیں جو اپنے علم و فضل، تقدس و تقویٰ اور عقل و خرد کے لحاظ سے ممتاز مقام کی حامل تھیں، لیکن نہ صرف یہ کہ کبھی کسی خاتون کو سربراہ حکومت نہیں بنایا گیا بلکہ کوئی ادنیٰ درجے کی تجویز بھی ایسی سامنے نہیں آئی کہ فلاں خاتون کو سربراہ مقرر کر دیا جائے، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس سلسلے میں قرآن و سنت کے احکام اس درجہ واضح تھے کہ کبھی کسی مسلمان کے دل میں عورت کو سربراہ بنانے کا کوئی خیال تک نہیں آیا، اور آج بھی

کیسے سکتا تھا جبکہ اسلام میں کسی ایسے سربراہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا جو کسی بھی حالت میں کبھی نماز کی امامت نہ کر سکے، جس کا جماعت سے نماز پڑھنا پسندیدہ نہ ہو۔

جو اگر کبھی جماعت میں شامل ہو تو اسے تمام مردوں کے پیچھے کھڑا ہونا پڑے۔ جس پر ہر مہینے چند روز ایسے گزرتے ہوں جب اس کے لئے مسجد میں داخل ہونا بھی جائز نہ ہو۔

جس پر جمعہ فرض نہ ہو۔

جس کیلئے کسی جنازے کے ساتھ جانا جائز نہ ہو۔

جو بغیر محرم کے سفر نہ کر سکے۔

جو تنہا حج نہ کر سکے۔

جس پر جہاد فرض نہ ہو۔

جس کی گواہی آدمی گواہی سمجھی جائے۔

جس کیلئے بلا ضرورت گھر سے نکلنا بھی جائز نہ ہو۔

جس کا نان نفقہ شادی سے پہلے باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر

واجب ہو۔

جو کسی کے نکاح میں ولی نہ بن سکے۔

اور حد یہ ہے کہ جسے اپنے گھر میں بھی سربراہی کا منصب حاصل نہ ہو^(۱)۔

(۱) قرآن کریم کی رو سے تو یہ واضح ہے، لیکن آزادی نسواں کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس دور میں بھی کوئی ایسا معاشرہ روسے زمین پر ہمارے علم میں نہیں جہاں شوہر کے ہوتے ہوئے عورت کو ”سربراہ خاندان“ قرار دیا ہو۔

اجماع امت:

قرآن و سنت کے مذکورہ بالا دلائل کی وجہ سے چودہ صدیوں کے ہر دور میں امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اسلام میں سربراہ حکومت کی ذمہ داری کسی عورت کو نہیں سونپی جاسکتی، اور اجماع امت شریعت کی ایک مستقل دلیل ہے۔ اجماع کے ثبوت کیلئے اس تحریر کے شروع میں ہم علامہ ابن حزم کا اقتباس پیش کر چکے ہیں، انہوں نے جو کتاب صرف اجماعی مسائل کی تحقیق کے لئے لکھی ہے اس میں فرمایا ہے کہ:

واتفقوا على أن الإمامة لا تجوز لامرأة.

”تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ حکومت کی سربراہی کسی عورت کیلئے جائز نہیں ہے“

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ جیسے باخبر عالم نے ”نقد مراتب الأجماع“ کے نام سے علامہ ابن حزمؒ کی مذکورہ کتاب پر ایک تنقید لکھی ہے، اور بعض ان مسائل کا ذکر فرمایا ہے جن میں علامہ ابن حزم نے اجماعی قرار دیا ہے، لیکن علامہ ابن تیمیہؒ کی تحقیق کے مطابق وہ اجماعی نہیں ہیں، بلکہ ان میں کسی نہ کسی کا اختلاف موجود ہے۔ اس کتاب میں بھی انہوں نے عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں علامہ ابن حزم پر کوئی اعتراض نہیں کیا^(۱)۔

ان حضرات کے علاوہ جن علماء فقہاء اور اسلامی سیاست کے ماہرین نے اسلام کے سیاسی نظام پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے ہر ایک نے اس مسئلہ کو ایک متفقہ مسئلہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔

علامہ ماوردیؒ کی کتاب اسلامی سیاست کا اہم ترین مأخذ سمجھی جاتی ہے، اس

(۱) دیکھئے کتاب نقد مراتب الأجماع لابن تیمیہ ص ۱۳۶

میں انہوں نے حکومت کی سربراہی تو کجا، عورت کو وزارت کی ذمہ داری سونپنا بھی ناجائز قرار دیا ہے، بلکہ انہوں نے وزارت کی دو قسمیں کی ہیں ایک وزارت تفویض جس میں پالیسی کا تعین بھی وزراء کا کام ہوتا ہے اور دوسرے وزارت تنفیذ جو پالیسی کا تعین نہیں کرتی بلکہ طے شدہ پالیسی کو نافذ کرتی ہے انہوں نے بتایا ہے کہ وزارت تنفیذ میں اہلیت کی شرائط وزارت تفویض کے مقابلے میں کم ہیں، اس کے باوجود وہ عورت کو وزارت تنفیذ کی ذمہ داری سونپنا بھی جائز قرار نہیں دیتے۔ وہ لکھتے ہیں:

وأما وزارة تنفيذ فحكمها أضعف و شروطها أقل..... ولا

يجوز أن تقوم بذلك امرأة، وإن خبرها مقبولاً لما تضمنه

معنى الولاية المصروفة عن النساء لقول النبي ﷺ:

ما أفلح قوم أسند أمرهم إلى امرأة، ولأن فيها من طلب

الرأى و ثبات العزم ما تضعف عنه النساء، ومن الظهور في

مباشرة الأمور ما هو عليهن محظور^(۱).

جہاں تک وزارت تنفیذ کا تعلق ہے وہ نسبتاً کمزور ہے اور اس کی شرائط

کم ہیں..... لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت اس کی ذمہ دار بنے

اگرچہ عورت کی خبر مقبول ہے کیونکہ یہ وزارت ایسی ولایتوں پر

مشتمل ہے جن کو (شریعت نے) عورتوں سے الگ رکھا ہے، حضور

ﷺ کا ارشاد ہے:

”جو قوم اپنے معاملات کسی عورت کے سپرد کرے وہ فلاح نہیں پائے

گی“ نیز اس لئے بھی کہ اس وزارت کیلئے جو اصابت رائے اور اولوا

(۱) الأحكام السلطانية للماوردی، ص ۲۷۲۵

لعز می درکار ہے عورتوں میں اس کے لحاظ سے ضعف پیدا جاتا ہے، نیز اس وزارت کے فرائض انجام دینے کیلئے ایسے انداز سے لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا پڑتا ہے جو عورتوں کیلئے شرعاً ممنوع ہے۔

اسلام کے سیاسی نظام پر ماخذ امام ابو یعلیٰ حنبلی ہیں، انہوں نے بھی اپنی کتاب میں لفظ بلفظ یہی عبارت تحریر فرمائی ہے۔

امام الحرمین علامہ جوینیؒ نے اسلام کے سیاسی نظام پر بڑے معرکے کی کتابیں لکھی ہیں، وہ نظام الملک طوسیؒ جیسے نیک نام حاکم کے زمانے میں تھے، اور انہی کی درخواست پر انہوں نے اسلام کے سیاسی احکام پر اپنی مجتہدانہ کتاب ”غیاث الامم“ تحریر فرمائی ہے، اس میں وہ سربراہ حکومت کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن الصفات اللازمة للمعتبرة: الذکورة والحرية، و نحيضة العقل والبلوغ، ولا حاجة إلى اطناب في نصب الدلالات على إثبات هذه الصفات^(۱)

”اور جو لازمی صفات سربراہ کیلئے شرعاً معتبر ہیں، ان میں سے اس کا مذکر ہونا، آزاد ہونا اور عاقل و بالغ ہونا بھی ہے، اور ان شرائط کو ثابت کرنے کیلئے تفصیلی دلائل پیش کر کے طول دینے کی ضرورت نہیں۔“

یہی امام الحرمینؒ اپنی ایک دوسری کتاب ”الارشاد“ میں تحریر فرماتے ہیں:-

وأجمعوا أن المرأة لا يجوز أن تكون اماماً، وإن اختلفوا في جواز كونها قاضية فيما يجوز شهادتها فيه.

”اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عورت کیلئے سربراہ حکومت مینا جائز نہیں، اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ جن امور میں اس کی گواہی جائز ہے ان میں وہ قاضی بن سکتی ہے یا نہیں“^(۱)

علامہ قلعشندہؒ ادب و انشاء اور تاریخ و سیاست کے امام سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے اسلام کے اصول سیاست پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے سربراہ حکومت کی چودہ صفات اہلیت بیان کی ہیں، ان شرائط کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:

”الأول: الذکورة..... والمعنى في ذلك أن الإمام لا يستغنى عن الاختلاط بالرجال والمشاورة معهم في أمور، والمرأة ممنوعة من ذلك ولأن المرأة ناقصة في أمر نفسها حتى لا تملك النكاح، فلا تجعل إليها الولاية على غيرها“

”پہلی شرط مذکر ہونا ہے..... اور اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ سربراہ حکومت کو مردوں کے ساتھ اختلاط اور ان کے ساتھ مشوروں کی ضرورت پیش آتی ہے اور عورت کیلئے یہ باتیں ممنوع ہیں اور اس کے علاوہ عورت اپنی ذات کی ولایت میں بھی کمزور ہے، یہاں تک کہ وہ نکاح کی ولی نہیں بن سکتی، لہذا اس کو دوسروں پر بھی ولایت نہیں دی جاسکتی“

امام بغویؒ پانچویں صدی ہجری کے مشہور مفسر، محدث اور فقیہ ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں:

اتفقوا على أن المرأة لا تصلح أن تكون إماماً لأن الإمام يحتاج إلى الخروج لإقامة أمر الجهاد، والقيام بأمر المسلمين والمرأة عورة لا تصلح للبروز^(۱).

”اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی کیونکہ امام کو جہاد کے معاملات انجام دینے اور مسلمانوں کے امور جہاد نمٹانے کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے، اور عورت پوشیدہ رہنی چاہیے، اس کا مجمع عام میں ظاہر ہونا درست نہیں“

قاضی ابو بکر ابن العربی حضرت ابو بکرؓ کی حدیث کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وهذا نص في أن المرأة لا تكون خليفة، ولا خلف فيه^(۲)

”اور یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں“

علامہ قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں ابن عربی کا یہ اقتباس نقل کر کے اس کی تائید کی ہے اور بتایا ہے کہ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں^(۳)۔ اور امام غزالی فرماتے ہیں:

الرابع : الذكورية، فلا تعتقد الإمامة لامرأة، وإن اتصفت

(۱) شرح السنة للبيهقي ص ۷۷ ج ۱۰، باب كراهية تولية النساء طبع بيروت ۱۴۰۵ھ

(۲) احكام القرآن للعربي ص ۱۴۴۵ ج ۳، سورة النمل

(۳) تفسير القرطبي ص ۱۸۳ ج ۱۳، سورة النمل

بجميع خلال الكمال وصفات الاستقلال^(۱).

”سربراہی کی چوتھی شرط مذکور ہوتا ہے، لہذا کسی عورت کی امامت منعقد نہیں ہوتی، خواہ وہ تمام اوصاف کمال سے متصف ہو اور اس میں استقلال کی تمام صفات پائی جاتی ہوں“

عقائد و کلام کی تقریباً تمام کتابیں امامت و سیاست کے احکام سے بحث کرتی ہیں اور سب نے مذکور ہونے کی شرط کو ایک اجماعی شرط کے طور پر ذکر کیا ہے۔ علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

يشترط في الإمام أن يكون مكلفاً حراً ذكراً عادلاً^(۲).

”سربراہ حکومت کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ عاقل بالغ ہو، آزاد ہو مذکر ہو، عادل ہو“

فقہاء و محدثین اور اسلامی سیاست کے علماء یہ چند اقتباسات محض مثال کے طور پر پیش کر دیئے گئے ہیں، ورنہ جس کتاب میں بھی اسلام کی سربراہی کی شرائط بیان کی گئی ہیں، وہاں مذکور ہونے کو ایک اہم شرط کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اگر کسی نے یہ شرط ذکر نہیں کی تو اس بناء پر کہ یہ عاقل اور بالغ ہونے کی شرط کی طرح اتنی مشہور معروف شرط تھی کہ اسے باقاعدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ورنہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں۔

عہد حاضر کے بعض محققین جنہوں نے اسلامی سیاست کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کے سربراہ بننے کے عدم جواز پر امت کا اجماع ہے۔ چند اقتباسات ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

(۱) فضائح الباطنية للغزالي ص ۱۸۰. ماخوذ از عبد الله الدميحي: الامامة العظمى ص ۲۴۵.

(۲) شرح المقاصد ص ۲۷۷ ج ۲.

ڈاکٹر محمد منیر عجلانی لکھتے ہیں:

لا نعرف بين المسلمين من أجاز خلافة المرأة، فالإجماع في هذه القضية تام، لم يشذ عنه أحد^(۱)
 ”ہمیں مسلمانوں میں کوئی ایسا عالم معلوم نہیں جس نے عورت کی خلافت کو جائز کہا ہو، لہذا اس مسئلے میں مکمل اجماع ہے جس کے خلاف کوئی شاذ قول بھی موجود نہیں“

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین الریس نے اسلام کے سیاسی احکام پر بڑی تحقیق کے ساتھ ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

إذا كان قد وقع بينهم خلاف فيما يتعلق بالقضاء، فلم يرو عنهم خلاف فيما يتعلق بالإمامة، بل الكل متفق على أنه لا يجوز أن يليها امرأة^(۲)

”اگرچہ فقہاء کے درمیان قضاء کے بارے میں تو اختلاف ہوا ہے (کہ عورت قاضی بن سکتی ہے یا نہیں) لیکن حکومت کی سربراہی کے بارے میں کوئی اختلاف مروی نہیں، بلکہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ کسی عورت کا سربراہی کے منصب پر فائز ہونا جائز نہیں“

ڈاکٹر ابراہیم یوسف مصطفیٰ عجو لکھتے ہیں:

مما أجمعت عليه الأمة على أن المرأة لا يجوز لها أن تلي رئاسة الدولة^(۳)

(۱) عقيدة الاسلام في اصول الحكم ص ۷۰ مطبوعة دار النفائس بيروت ۱۴۰۵ھ

(۲) النظريات السياسية الإسلامية ص ۲۹۴ مطبوعه دار التراث، القاهرة ۱۹۷۶ھ

(۳) تعليق تهذيب الرئاسة وترتيباً لسياسة للقلعي ص ۸۲

”اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ عورت کیلئے ریاست کی سربراہی سنبھالنا جائز نہیں“

عبد اللہ بن عمر بن سلیمان الدیبی لکھتے ہیں:

من شروط الإمام أن يكون ذكراً، ولا خلاف في ذلك بين العلماء^(۱)

”سربراہ حکومت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مذکر ہو، اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں“

عہد حاضر کے مشہور مفسر قرآن علامہ محمد امین شفقٹی تحریر فرماتے ہیں:

من شروط الإمام الأعظم كونه ذكراً، ولا خلاف في ذلك بين العلماء^(۲)

”امام اعظم (سربراہ حکومت) کی شرائط میں اس کا مذکر ہونا بھی داخل ہے، اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں“

اگر اس موضوع پر تاریخ اسلام کے ائمہ مفسرین، فقہاء، محدثین، متکلمین، اور اہل فکر و دانش کی تمام عبارتیں جمع کی جائیں تو یقیناً ان سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، لیکن یہ چند مثالیں یہ بات ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ اس مسئلے پر علماء اسلام کے درمیان اب تک چودہ صدیوں میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔

حافظ ابن جریر طبری کا مسلک:

ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے مشہور مفسر قرآن حافظ ابن جریر کی طرف غلط طور سے یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کے جواز کے

(۱) الإمامة العظمی عند أهل السنة ص ۲۴۳

(۲) اضاء البيان في تفسير القرآن بالقرآن ص ۶۵ ج ۱

قائل ہیں، لیکن کوئی بھی شخص امام ابن جریر کا کوئی اپنا اقتباس پیش نہیں کرتا۔ ان کی تصانیف میں سے تفسیر جامع البیان تیس جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے، اس میں سے کہیں کوئی ایک فقرہ بھی اب تک نہیں دکھاسکا جس سے ان کا یہ مؤقف معلوم ہوتا ہو، خود ہم نے بھی ان کی تفسیر کے ممکنہ مقامات کو دیکھا، لیکن کہیں اس میں کوئی ایسی بات نہیں ملی۔

اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب ”تہذیب الآثار“ کی بھی کچھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں مل سکی۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض علماء نے ان کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ عورت کو قاضی بنانے کے جواز کے قائل ہیں، بعض لوگوں نے اس بات کو غلط طور پر سربراہی کے جواز کے عنوان سے نقل کر دیا ہے۔ چنانچہ قاضی ابو بکر ابن العربی فرماتے ہیں:

وهذا نص في أن المرأة لا تكون خليفة، ولا خلاف فيه، ونقل عن محمد بن جرير الطبري إمام الدين أنه يجوز أن تكون المرأة قاضية، ولم يصح ذلك عنه، ولعله كما نقل عن أبي حنيفة أنها إنما تقضى فيما تشهد فيه، وليس بأن تكون قاضية وعلى الإطلاق، ولا بأن يكتب لها منشور، بأن فلانة مقدمة على الحكم، إلا في الدماء والنكاح، وإنما ذلك كسبيل التحكيم أو الاستانة في القضية الواحدة^(۱)

”اور یہ حضرت ابو بکرؓ کی حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی، اور اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ امام محمد بن جریر طبری سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک عورت کا قاضی ہونا جائز ہے، لیکن اس مذہب کی

نسبت انکی طرف صحیح نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب ایسا ہی ہوگا جیسا امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ عورت ان معاملات میں فیصلہ کر سکتی ہے جن میں وہ شہادت دے سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علی الاطلاق قاضی بن جائے، اور نہ یہ مطلب ہے کہ اس کو قاضی کے منصب پر مقرر کر دینا جائز ہے، اور یہ کہا جائے کہ فلاں عورت کو قصاص اور نکاح کے معاملات کے سوا دوسرے امور میں قاضی بنایا جا رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کسی مسئلے میں ثالث بنالیا جائے یا کوئی ایک مقدمہ جزوی طور پر اس کے سپرد کر دیا جائے۔“

امام ابن عربیؒ کی اس وضاحت سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

- (۱) سربراہی کا مسئلہ علیحدہ ہے اور قاضی بننے کا مسئلہ علیحدہ۔
- (۲) سربراہی کے مسئلے میں امام ابن جریرؒ سمیت تمام علماء کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ نہیں بن سکتی۔
- (۳) امام ابن جریر طبریؒ سے قاضی بننے کا جواز منقول ہے، لیکن ان کی طرف اس قول کی نسبت بھی درست نہیں۔
- (۴) امام ابو حنیفہؒ یا ابن جریرؒ سے عورت کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا جواز منقول ہے وہ اسکو باقاعدہ قاضی بنانے سے متعلق نہیں بلکہ جزوی طور سے بطور ثالث کوئی انفرادی قضیہ نمٹانے سے متعلق ہے۔

بہر کیف! اگر فقہاء کے درمیان کوئی تھوڑا بہت اختلاف ہے تو وہ عورت کے قاضی بننے کے بارے میں ہے، سربراہ حکومت بننے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، چنانچہ امام الحرمین جوینیؒ لکھتے ہیں۔

والذکورة لا شک فی اعتبارها، ومن جوز من العلماء تولی المرأة للقضاء فيما يجوز أن يكون شاهدة فيه، أحال انتصاب المرأة للإمامة، فإن القضاء قد یثبت مختصا، والإمامة يستحيل فی وضع الشرع ثبوتها علی الاختصاص^(۱).

”سربراہی کیلئے مذکور ہونے کی شرط میں کوئی شک نہیں ہے، اور جن علماء نے ان معاملات میں عورت کے قاضی بننے کو جائز کہا ہے جن میں عورت گواہ بن سکتی ہے، وہ بھی سربراہی کیلئے عورت کی تقرری کو ناممکن قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ قضاء کے بارے میں تو یہ ممکن ہے کہ اس کی حدود اختیار کو کچھ معاملات کے ساتھ خاص کر دیا جائے، لیکن حکومت کی سربراہی کو شرعی اصول کے مطابق کچھ محدود معاملات کے ساتھ خاص کرنا ممکن نہیں“

ملکہ بلقیس کا واقعہ:

ہمارے دور میں بعض لوگ عورت کی سربراہی کا جواز ملکہ بلقیس کے اس واقعے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں جو قرآن کریم نے سورہ نمل میں بیان فرمایا ہے۔ لیکن یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ اس واقعے سے عورت کے سربراہ حکومت بننے کا جواز کیسے ثابت ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ یہ ملکہ ان غیر مسلموں کی سربراہ تھی جو سورج کی پرستش کیا کرتے تھے۔ حد حد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کے بارے میں جو خبر دی وہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق یہ تھی:

(۱) غیث الامم للحوینی ص ۸۲ و ۸۳۔

﴿وَجَدْتَهَا وَقَوْمُهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾

”میں نے اس کو اور اس کی قوم کو پایا ہے کہ وہ اللہ کے بجائے سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔“

اس سے واضح ہے کہ وہ ایک سورج پرست قوم کی ملکہ تھی، اور خود بھی سورج کی پرستش کرتی تھی، اور ظاہر ہے کہ اگر ایک کافر قوم نے کسی عورت کو اپنا سربراہ بنایا ہو تو وہ قرآن و سنت کے واضح ارشادات کے مقابلے میں مسلمانوں کیلئے کیسے دلیل بن سکتی ہے؟

اگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو ملکہ تسلیم کر کے اپنی حکومت اس کے حوالے کر دی ہوتی تب تو یہ بات ثابت ہوتی کہ کم از کم حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں عورت سربراہ بن سکتی تھی، لیکن قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ سارا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس کے نام جو خط بھیجا وہ قرآن کریم کے مبارک الفاظ میں یہ تھا:

﴿أَلَا تَعْلَمُو عَلَى وَأَتُونِي مُسْلِمِينَ﴾

”کہ تم میرے مقابلے میں سر نہ اٹھاؤ اور میرے پاس فرماں بردار بن کر آ جاؤ“ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی حکومت کو نہ صرف یہ کہ تسلیم نہیں فرمایا بلکہ اس کو اپنے زیر نگین آنے کا حکم دیا اور پھر اسی پر بس نہیں آپ نے اس کا بھیجا ہوا تحفہ بھی قبول نہیں کیا بلکہ اسے واپس کرادیا، حالانکہ دوسرے براہوں کے درمیان تحائف کا تبادلہ ایک معمول کی بات ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کا تخت بھی اٹھا کر منگوایا اور اس کی ہیبت بھی بدل ڈالی۔ یہاں تک کہ جب ملکہ

بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے محل میں آئیں تو قرآن کریم کے بیان کے مطابق انہوں نے کہا کہ :-

﴿رب اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ (سورة النمل: ۴۴)

”پروردگار! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کے آگے جھک گئی۔“

بس یہ ہے وہ واقعہ جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اور بلقیس کے اس جملہ پر قصے کا اختتام ہو گیا، جو بھی شخص اس واقعے کو قرآن کریم میں دیکھے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا، اس کو اپنا فرماں بردار بن کر حاضر ہونیکا حکم دیا، اور بالآخر اس کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور خود ملکہ بلقیس نے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے کے بعد اپنی فرماں برداری کا اعلان کر دیا۔

اس واقعے میں کہیں دور دور کوئی ایسا شائبہ بھی نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی حکومت کو جائز قرار دیا تھا یا اسے تسلیم فرمایا تھا۔

بعض لوگ کچھ اسرائیلی روایات پیش کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے نکاح کر کے انہیں واپس یمن بھیج دیا تھا لیکن یہ قطعی طور پر غیر مستند روایت ہے، کسی بھی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں ہے، اس معاملے میں تاریخی روایتیں بہت متضاد ہیں بعض میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے نکاح کر کے انہیں اپنے پاس رکھا بعض میں ہے کہ انہیں شام بھیج دیا بعض میں ہے کہ انہیں یمن لوٹا دیا، بعض میں ہے کہ ان کا نکاح ہمدان کے بادشاہ سے کر دیا۔ علامہ قرطبیؒ یہ تمام غیر مستند روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے

ہیں:

لم یرد فیہ خبر صحیح لا فی أنه تزوجها ولا فی أنه زوجها.

”اس کے بارے میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے، نہ اس بارے میں کہ انہوں نے بلقیس سے نکاح کیا اور نہ اس بارے میں کہ کسی اور سے اس کا نکاح کر لیا۔“

جب ملکہ بلقیس کے اسلام کے بعد کے واقعات کسی بھی صحیح تاریخی روایت سے ثابت نہیں ہیں تو صاف اور سیدھا راستہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے جتنا واقعہ بیان فرمایا ہے صرف اتنے واقعات پر ایمان رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ اس واقعے میں ملکہ بلقیس کی سلطنت کے بقاء کا نہیں بلکہ فرماں بردار ہو جانیکا ذکر ہے، اسلام کے بعد سربراہ بنانے کا ذکر نہیں ہے، لہذا اس واقعے سے عورت کی سربراہی پر استدلال کا کوئی ادنیٰ جواز موجود نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ اور جنگ جمل:

بعض لوگ عورت کی سربراہی پر جنگ جمل کے واقعے سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس جنگ کی قیادت کی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کبھی خلافت یا حکومت کی سربراہی کا دعویٰ نہیں کیا نہ ان کے ساتھیوں میں سے کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات تھی کہ ان کو خلیفہ بنایا جائے، ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینا قرآن کریم کے احکام کے مطابق ضروری ہے، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت تمام ازواج مطہرات رچ کیلئے مکہ مکرمہ آئی ہوئی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری ازواج مطہرات نے شروع میں یہ چاہا کہ وہ واپس مدینہ طیبہ پہنچ کر حضرت علیؓ کو قصاص

لینے پر آمادہ کریں، لیکن بہت سے لوگوں نے یہ رائے دنی کہ پہلے بصرہ جا کر وہاں کے لوگوں سے حمایت حاصل کی جائے۔ دوسری تمام ازواج مطہرات نے تو بصرہ جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ہم مدینہ منورہ کے سوا کہیں اور نہیں جائیں گے لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان حضرات کی رائے سے متاثر ہو گئیں اور بصرہ روانہ ہو گئیں (۱)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد جنگ کرنا بھی نہیں تھا بلکہ جب آپ بصرہ جا رہی تھیں تو راستے میں ایک جگہ پڑاؤ الا رات کے وقت وہاں کتے بھونکنے لگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ لوگوں نے جواب دیا یہ مقام ”حواب“ ہے ”حواب“ کا نام سنتے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چونک اٹھیں، انہیں آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد یاد آگیا۔ آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے ایک دن فرمایا تھا:

کیف باخذ اکن تنبح علیہا کلاب الحواب (۲)۔

”تم میں سے ایک کا اس وقت کیا حال ہو گا جب اس پر حواب کے کتے بھونکیں گے“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حواب کا نام سن کر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور اپنے ہاتھیوں سے اصرار کیا کہ مجھے واپس لوٹا دو اور ایک دن ایک رات وہیں ٹھہری رہیں لیکن بعض حضرات نے کہا کہ آپ چلی چلیں، آپ کی وجہ سے

(۱) البدایہ والنہایہ ص ۲۳۰ ج ۷۔

(۲) مسند احمد ج ۶ ص ۵۲ و ۹۷، ومستدرک حاکم ص ۱۲۰ ج ۳، وصحیحہ الحاکم ووافقہ الذہبی، وقال الحافظ فی الفتح ۱۳، ۴۵: ”سندہ علی شرط الصحیح“ وصحیحہ ابن

کثیر فی البدایہ ص ۲۱۲ ج ۶۔

مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح ہو جائے گی، اور بعض روایات میں ہے کہ کسی نے آپ کے سامنے تردید بھی کی کہ یہ یہ جگہ حواب نہیں ہے (۱) اور اسی طرح جو مقدور میں تھا وہ پیش آیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سفر دوبارہ شروع فرما دیا، بصرہ پہنچ کر جب آپ سے آنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا:

أی بنی! إلا صلاح بین الناس

”بیٹے! میں لوگوں کے درمیان صلح کرانے آئی ہوں“

ان تمام باتوں سے واضح ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصد نہ کوئی سیاست تھی نہ حکومت، نہ وہ جنگ کرنا چاہتی تھیں، بلکہ حضرت عثمان کے قصاص کے جائز مطالبے کی تقویت اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان مصالحت کے خالص دینی مقاصد آپ کے پیش نظر تھے۔

اس کے باوجود چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چونکہ خواتین کے مسلمہ دائرہ کار سے باہر نکل کر اجتماعی معاملات میں دخل دیا تھا، اس لئے صحابہ کرامؓ اور خود دوسری امہات المؤمنین کو آپ کا یہ اقدام پسند نہ آیا، اور متعدد صحابہؓ نے آپ کو خطوط لکھے۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ نے اس موقع پر آپ کو ایک بڑا اثر انگیز خط لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

”نبی ﷺ کی زوجہ ام سلمہ کی طرف سے ام المؤمنین عائشہ کے نام:

میں آپ سے اس اللہ کی حمد کرتی ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اما بعد! آپ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان ایک

دروازہ ہیں، آپ وہ پردہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی حرمت پر ڈالا گیا

ہے، قرآن نے آپ کے دامن کو سمیٹا ہے آپ استے پھیلائیے

(۱) البدایہ والنہایہ ص ۲۳۱ ج ۷۔

نہیں، اور آپ کی حرمت کی حفاظت کی ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوتا کہ خواتین پر جہاد کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو وہ آپ کو اسکی وصیت کرتے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے شہروں میں آپ کو آگے بڑھنے سے روکا تھا؟ اس لئے کہ اگر دین کا ستون متزلزل ہونے لگے تو وہ عورتوں سے کھڑا نہیں ہو سکتا اور اگر اس میں شگاف پڑنے لگے تو عورتوں سے اس کا بھراؤ ممکن نہیں، عورتوں کا جہاد یہ ہے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں، دامنوں کو سمیٹیں اور چھوٹے قدموں سے چلیں۔ آپ جن صحراؤں میں ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ تک اپنی اونٹنی دوڑا رہی ہیں اگر وہاں رسول اللہ ﷺ آپ کے سامنے آجائیں تو آپ کے پاس ان سے کہنے کو کیا ہوگا؟ کل آپ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس جانا ہے اور میں قسم کھاتی ہوں کہاں گھر سے کہا جائے کہ ام سلمہ! جنت میں چلی جاؤ، تب بھی مجھے اس بات سے حیا آئے گی کہ میں رسول اللہ ﷺ سے اس حال میں ملوں کہ جو پردہ آپ نے مجھ پر ڈالا تھا اسے میں چاک کر چکی ہوں، لہذا آپ اس کو اپنا پردہ بنائیے، اپنے گھر کی چار دیواری کا اپنا قلعہ سمجھئے، کیونکہ جب تک آپ اپنے گھر میں رہیں گی اس امت کی سب سے بڑی خیر خواہ ہوں گی^(۱)۔

(۱) عربی عبارت یہ ہے:-

”عن أم سلمة زوج النبي ﷺ، إلى عائشة أم المؤمنين: فاني أحمد إليك الله الذي لا اله الا هو، أما بعد، انك سيدة بين رسول الله ﷺ وأمته، وحجاب مضروب على حرمته، قد جمع القرآن ذيلك فلا تندحيه، وسكند خفارتك فلا تبذل لها، فالله من وراء هذه الأمة، ولو علم رسول الله ﷺ أن النساء يحتملن الجهاد عهد إليك، (باقی اگلے صفحہ میں)

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ کے اس مکتوب کے ایک ایک لفظ سے دین کا وہ پاکیزہ مزاج ٹپک رہا ہے جس نے عورت کو حرمت و تقدیس کا اعلیٰ ترین مقام عطا فرمایا ہے، اور جس کے آگے تمام سیاسی مناصب اور دنیوی شان و شوکت یقیناً سہمہ۔ حضرت عائشہ نے حضرت ام سلمہ کی کسی بات کا انکار نہیں کیا، بلکہ ان کی نصیحت کو اصولی طور پر قبول فرمایا، اور اس کی یہ کہہ کر قدر دانی فرمائی:

فما أقبلني لو عظك، و أعرفني لحق نصيحتك

”میں آپ کی نصیحت کو خوب قبول کرتی ہوں، اور آپ کے حق

نصیحت سے اچھی طرح باخبر ہوں“

البتہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

ولنعم المطلع مطلع فرقت فيه بين فيئتين متشاجرتين من المسلمين.

”وہ موقف بہت اچھا موقف ہے جس کے ذریعے میں مسلمانوں کے

دو جھگڑتے ہوئے گروہوں کے درمیان حائل ہو سکوں“

(بقیہ صفحہ گزشتہ) أما علمت أنه قد نهك عن الفراطة في البلاد فان عمود الدين لا يثبت بالنساء، ان ما، ولا يراى بهن ان انصدع؟ جهاد النساء، غضن الاطراف، وضم الذبول، وقصد الوهارة. ما كنت قانلة لرسول الله ﷺ لو عارضك بعض هذه الفلوات ناصة قعودا من منهل الى منهل؟ وغدا تردين على رسول الله ﷺ، وأقسم لو قيل لي: يا أم سلمة ادخلی الجنة لاستحييت أن ألقى رسول الله ﷺ هاتكة حجاباً صراية على فاجعليه سترك، ووقاعة البيت حصنك، فانك أنصح ما تكرنين لهذه الأمة ما تعدت عن بصرتهم“.

(العقد الفريد ص ۶۶ ج ۵ مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ)

جس سے صاف واضح ہے کہ نہ وہ حکومت کی سربراہی چاہتی ہیں، نہ جہاد ان کے پیش نظر ہے، نہ کوئی سیاسی قیادت مقصود ہے بلکہ پیش نظر دو فریقوں کے درمیان صلح کرانا ہے۔ اور اس میں بھی وہ فرماتی ہیں:

فإن أقعد ففی غیر حرج، وإن أمض فإلی ما لا غنی لی عن
الازدیاد منه^(۱).

”اب میں اگر بیٹھ گئی تب بھی کوئی حرج نہیں، اور اگر میں آگے بڑھی تو ایک ایسے کام کے لئے آگے بڑھوں گی جس کو مزید انجام دینے کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہ رہے۔“

اتنی احتیاط کے باوجود، وہ زمانہ فتنے کا تھا، دشمنوں کی سازشیں سرگرمی سے کام کر رہی تھیں، جن کا واحد مقصد یہ تھا کہ باہم مسلمانوں کو باہم لڑایا جائے، چنانچہ جو کچھ مقدر میں تھا وہ پیش آکر رہا، جنگ جمل ہوئی اور حضرت عائشہؓ اس مقام پر پہنچ چکی تھیں جہاں سے واپس نہ آ سکیں۔

حضرت ام سلمہؓ کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ کرام نے انہیں گھر سے باہر کی اس محدود ذمہ داری کو اٹھانے سے روکا۔ چنانچہ حضرت زید بن صوحانؓ نے حضرت عائشہؓ کو ایک خط میں لکھا:

سلام عليك. أما بعد: فإنك أمرت بأمر و أمرنا بغيره، أمرت
أن تقری فی بیتك، وأمرنا أن نقاتل الناس حتی لا تكون
فتنة، فتركت ما أمرت به وكتبت تنهيننا عما أمرنا به،
والسلام^(۲).

(۱) العقد الفرید ص ۶۶ ج ۵.

(۲) ایضاً ص ۶۷ ج ۵.

”سلام کے بعد، آپ کو ایک کام کا حکم دیا گیا ہے، اور ہمیں دوسرے کام کا، آپ کو حکم ہے کہ گھر میں قراستہ رہیں اور ہمیں حکم ہے کہ ہم لوگوں سے اس وقت تک لڑیں جب تک فتنہ باقی رہے، آپ نے اپنے کام کو چھوڑ دیا اور ہمیں اس کام سے روک رکھی ہیں جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔“

پھر یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی خود حضرت عائشہؓ بعد میں اپنے اس فعل پر انتہائی ندامت کا اظہار فرماتی رہی ہیں، چنانچہ حافظ شمس الدین ذہبیؒ فرماتے ہیں:

ولا ریب أن عائشة ندمت ندامة كلية علی مسیرها الی
البصرة وحضورها یوم الجمل، وما ظننت أن الأمر یبلغ ما
بلغ^(۱).

”اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عائشہؓ اپنے بصرہ کے سفر اور جنگ جمل میں حاضری پر کلی طور سے نادم ہوئیں، ان کا گمان یہ نہیں تھا کہ بات وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک جا پہنچی۔“

امام ابن عبد البرؒ نے اپنی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا کہ ”تم نے مجھے اس سفر پر جانے سے کیوں منع نہیں کیا؟“ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا: ”میں نے دیکھا کہ ایک صاحب (یعنی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ) آپ کی راسخہ پر غالب آگئے ہیں“ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: بخدا، اگر تم مجھے روک دیتے تو میں نہ نکلتی^(۲)۔

پھر جنگ جمل اور اس کے سفر پر حضرت عائشہؓ کی ندامت کا یہ عالم تھا کہ

(۱) سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۱۷۷ ج ۲.

(۲) نصب الراية للزیلعی ص ۷۰ ج ۴.

جب تلاوت قرآن کریم کے دوران وہ سورہ احزاب کی اس آیت پر پہنچتیں جس میں اللہ تعالیٰ نے خواتین کو یہ حکم دیا ہے کہ:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾

”اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو“

تو اس قدر روتی تھیں کہ آپ کی اوڑھنی آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی^(۱)۔ اور ندامت کی انتہاء یہ ہے کہ شروع میں آپ کی خواہش یہ تھی کہ انہیں ان کے گھر میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے ساتھ دفن کیا جائے، لیکن جنگِ جمل کے بعد آپ نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ قیس بن ابی حازم راوی ہیں کہ:

قالت عائشة رضي الله عنها ، وكان تحدث نفسها أن تدفن في بيتها مع رسول الله ﷺ و أبي بكر، فقالت: إني أحدث بعد رسول الله ﷺ حدثاء، أدفنوني مع أرواحه، فدفنت بالبقيع^(۲)۔

”حضرت عائشہ دل میں یہ سوچتی تھیں کہ انہیں ان کے گھر میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ دفن کیا جائے، لیکن بعد میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد ایک بدعت کا ارتکاب کیا ہے، اب مجھے آپ کی دوسری ازواجِ مطہرات کے ساتھ دفن کرنا، چنانچہ انہیں بقیع میں دفن کیا گیا“

(۱) طبقات ابن سعد ص ۸۰ ج ۴، سیر اعلام النبلاء للذہبی ص ۱۷۷ ج ۲ روایت یہ ہے:

”إذا قرأت هذه الآية وقرن في بيوتكن بكت حتى تبل خمارها“

(۲) مستدرک الحاکم ص ۶ ج ۴ قال الحاکم: ”هذا حديث صحيح على شرط شيخين“

ووافقه الذہبی۔

حافظ ذہبیؒ ان کے اس قول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تعني بالحدث مسيرها، فإنها ندمت ندامة كلية و ثابت من ذلك ، على ما فعلت ذلك إلا متأولة قاصدة للخير^(۱)۔

”بدعت سے حضرت عائشہ کی مراد جنگِ جمل میں ان کا جانا تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنے اس عمل پر کلی طور پر نادم تھیں، اور اس سے توبہ کر چکیں تھیں، باوجودیکہ ان کا یہ اقدام اجتہاد پر مبنی تھا اور ان کا مقصد نیک تھا۔“

ان تمام واقعات سے واضح ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہ کبھی حکومت کی سربراہی کی خواہش یا دعویٰ کیا، نہ کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ ان کو سربراہ بنایا جائے نہ ان کا مقصد کسی باقاعدہ جنگ کی قیادت تھی، وہ صرف ایک قرآنی حکم کے نفاذ اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کیلئے نکلی تھیں، لیکن دشمنوں کی سازش نے ان کے سفر کو بالآخر ایک جنگ کی شکل دے دی، لیکن چونکہ ان کا مشن فی الجملہ ایک محدود سیاسی حیثیت کا حامل تھا، اس لئے صحابہ کرام نے بھی اسے پسند نہیں کیا، اور وہ خود بھی اس پر بے انتہا نادم ہوئیں، یہاں تک کہ اس ندامت کی بناء پر روضہ رسول ﷺ میں تدفین کو بھی پسند نہیں فرمایا۔

اب خود انصاف سے فیصلہ کر لیا جائے کہ ام المومنین حضرت عائشہ نے اپنے جس اقدام کو بالآخر غلط سمجھا اس پر روتی رہیں اس پر ندامت کی وجہ سے تدفین میں آنحضرت ﷺ کے قریب ہونے سے بھی شرمائیں، اس عمل سے کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے؟ اور استدلال بھی سربراہی کے جواز پر جس کا تصور بھی حضرت عائشہ کے حاشیہ خیال میں نہیں گزرا۔

(۱) سیر اعلام النبلاء ص ۱۹۳ ج ۲۔

حضرت تھانویؒ کی ایک تحریر:

ہمارے زمانے میں بعض حضرات نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی ایک تحریر بھی عورت کی سربراہی کے جواز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو امداد الفتاویٰ میں شائع ہوئی ہے، جس میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث ”لن یفلح قوم ولوا امرہم امرأۃ“ کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ جمہوری حکومت اس وعید کے تحت داخل نہیں ہے۔

لیکن حضرت تھانوی کی اس تحریر کی حقیقت کو سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی پوری امت کے علماء کی طرح اسی بات کے قائل ہیں کہ عورت کو اسلامی حکومت کی سربراہ بنانا جائز نہیں ہے، چنانچہ امداد الفتاویٰ کی اسی تحریر میں حضرت نے خود تحریر فرمایا ہے کہ:

”حضرات فقہاء نے امامت کبریٰ (حکومت کی سربراہی) میں ذکورت

(مرد ہونے) کو شرط صحت، اور قضا میں گو شرط صحت نہیں مگر شرط

صون عن الاثم فرمایا ہے^(۱)۔

نیز حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ نے اپنی تفسیر میں اس مسئلے کو مزید وضاحت کے ساتھ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

”اور ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے پس

بلیقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے، اول یہ تو فعل مشرکین کا تھا،

(۱) امداد الفتاویٰ ص ۹۲ ج ۵۔

دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں^(۱)۔

نیز حضرت تھانوی نے ”احکام القرآن کا جو حصہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ سے لکھوایا ہے، اس میں بھی ملکہ بلیقیس کے واقعے کے تحت یہ مسئلہ وضاحت سے بیان کیا ہے اور خود حضرت تھانوی کے حوالے سے اس استدلال کو رد کیا ہے کہ قرآن کریم نے بلیقیس کا واقعہ بیان کر کے اس پر کوئی نکیر نہیں کیا^(۲)۔

حضرت تھانویؒ کی ان عبارتوں سے واضح ہے کہ وہ علمائے امت کی طرح اسی بات کے قائل ہیں کہ عورت کو سربراہ حکومت بنانا شرعاً جائز نہیں ہے۔ البتہ سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر کسی جگہ اس شرعی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی عورت کو سربراہ بنادیا گیا ہو تو کیا ایسی جگہ کے لوگوں پر وہ وعید صادق آئے گی جو حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ ایسی قوم فلاح نہیں پاسکتی؟ اس کے جواب میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا کہ اگر حکومت عام ہو اور تمام ہو جیسا کہ شخصی حکومتوں میں ہوتا ہے (یا جیسا کہ اسلامی خلافت میں ہوتا ہے اور اس کا سربراہ عورت کو بنادیا جائے) تو بے شک اس پر حدیث کی یہ وعید صادق آئے گی، لیکن اگر حکومت جمہوری انداز کی ہو تو عدم فلاح ضروری نہیں، جس کی وجہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان فرمائی کہ:

”راز اس میں یہ ہے کہ حقیقت اس حکومت کی محض مشورہ ہے، اور

(۲) بیان القرآن ص ۸۵ ج ۸ سورۃ النمل۔

(۳) احکام القرآن للمفتی محمد شفیع رحمہ اللہ ص ۲۹ ج ۳۔

عورت اہل ہے مشورہ کی (۱)۔

اس سے صاف واضح ہے کہ عورت کی ”حقیقی حکومت“ کو حضرت تھانویؒ نہ صرف یہ کہ ناجائز بلکہ موجب عدم فلاح بھی قرار دے رہے ہیں، لہذا اصل مسئلہ کی حد تک ان کا موقف وہی ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی البتہ جمہوری حکومت کے بارے میں انہوں نے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ وہ حقیقتاً حکومت ہے ہی نہیں محض ایک مشورہ ہے۔

لہذا حضرت تھانویؒ کی تحریر کا سارا دار و مدار اس بات پر ٹھہرا کہ جمہوری حکومت واقعہ حکومت ہے یا محض ایک مشورہ ہے؟ اور یہ سوال شرعی حکم کا نہیں بلکہ واقعے کا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمہوری حکومت کے سربراہ کے بارے میں یہ سمجھا کہ حقیقتہً وہ سربراہ نہیں ہوتا بلکہ پارلیمنٹ کا ایک رکن ہونے کی حیثیت میں اس کی بات محض ایک مشورے کی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ اسی تحریر میں وہ فرماتے ہیں:

”کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والی صوری در حقیقت والی نہیں ہے بلکہ ایک رکن مشورہ ہے اور والی حقیقی مجموعہ مشیروں کا ہے“ (۲)۔

اس فقرے سے ایک بار پھر واضح ہو گیا کہ وہ عورت کی سربراہی کے ناجائز اور موجب عدم فلاح ہونے کو تسلیم فرماتے ہیں اور اس مسئلے انہیں کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن جمہوری حکومت کے سربراہ کو وہ اپنی معلومات کے مطابق حقیقی سربراہ نہیں سمجھ رہے۔ یہ اختلاف اصل مسئلے میں نہیں بلکہ جمہوری حکومت کی حقیقت میں ہے۔

(۱) امداد الفتاویٰ ص ۹۲ ج ۵

(۲) امداد الفتاویٰ ص ۹۱ ج ۵

واقعہ یہ ہے کہ پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم اگرچہ پارلیمنٹ کا ایک رکن ہونے کی حیثیت میں محض ایک رکن مشورہ ہے، لیکن اس دو حیثیتیں اور ہیں جنکی موجودگی میں اس کو محض ایک ”رکن مشورہ“ قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ پہلی حیثیت تو یہ ہے کہ وہ ملک کی انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے اور اپنی اس حیثیت میں وہ آئین و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے مکمل طور سے خود مختار ہے، یہاں تک کہ اسے یہ اختیار ہے کہ وہ پوری کابینہ کے مشورے کو رد کر کے وہ کام کرے جو اس کی رائے کے مطابق ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ جمہوری نظام میں ریاست کے تین کام الگ الگ کر دیئے گئے ہیں۔ ایک کام قانون سازی ہے جو مقننہ یعنی پارلیمنٹ کے سپرد ہے، دوسرے کام ملک کے انتظام کو چلانا ہے جو انتظامیہ کے سپرد ہے اور تیسرے کام تازعات کا فیصلہ کرنا ہے جو عدلیہ کے سپرد ہے، اب ریاست ان تین اداروں مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں سے لفظ ”حکومت“ کا اطلاق انتظامیہ ہی پر ہی ہوتا ہے۔

مقننہ اور عدلیہ ریاست (STATE) کے ذیلی ادارے ضرور ہیں لیکن ”حکومت“ (GOVERNMENT) کا حصہ نہیں ہیں۔ حکومت صرف انتظامیہ ہی کو کہا جاتا ہے۔ اور وزیر اعظم اس انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے، اسے آئین کے دائرے میں رہتے ہوئے کاروبار حکومت مکمل طور پر چلانے کا اختیار حاصل ہے، نہ وہ ہر چیز کو مقننہ کے مشورے کیلئے پیش کرتا ہے، نہ کر سکتا ہے، نہ اس کا پابند ہے۔ اہم انتظامی فیصلے وہ کابینہ میں رکھتا ضرور ہے لیکن کابینہ کی رائے کا پابند نہیں ہے، بلکہ کابینہ کے اجلاس میں اس کا فیصلہ حتمی حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے با اختیار شخص کو محض ”رکن مشورہ“ نہیں کہا جاسکتا۔

مقننہ کی حد تک پیشک وہ ایک ”رکن مشورہ“ ہے لیکن پارلیمانی پارٹیوں کے

مروجہ نظام میں اس کی ایک اور حیثیت ہے جس نے اسے مقننہ میں بھی محض ”رکن مشورہ“ نہیں رہنے دیا اور وہ حیثیت یہ ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں برسرِ اقتدار اکثریتی پارٹی کا لیڈر اور قائد ایوان ہوتا ہے، لہذا پارلیمنٹ میں اس کی رائے محض ایک شخص رائے نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات ایوان کی اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے۔ بالخصوص اگر وہ اپنی جماعت کے ارکان پارلیمنٹ کیلئے جماعت کی طرف سے کوئی ہدایت جاری کرے تو اس کی جماعت کے تمام ارکان اسی کی ہدایت کے مطابق اسمبلی میں ووٹ دینے کے پابند ہیں۔ پارلیمانی اصطلاح میں اس ہدایت کو ”جماعتی کوڑا“ (PARTY WHIP) کہا جاتا ہے، یعنی اس کوڑے کو حرکت میں لانے کے بعد تمام ارکان جماعت پارلیمنٹ میں وہی رائے دینے پر مجبور ہیں جس کے لئے وہ کوڑا حرکت میں لایا گیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جو شخص یہ کوڑا حرکت میں لاتا ہے اس کو محض ایک ”رکن مشورہ“ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لحاظ سے مقننہ میں بھی وزیراعظم کی حیثیت محض ایک رکن مشورہ کی نہیں بلکہ قائد جماعت اور قائد ایوان کی ہوتی ہے اور عملدہ دوسروں کے مشورے پر کم اور دوسرے اس کے مشورے پر زیادہ چلتے ہیں۔

اگرچہ نظریاتی اعتبار سے صدر مملکت ریاست کا سربراہ ہوتا ہے اور وزیراعظم انتظامیہ کا، لیکن پارلیمانی نظام میں صدر مملکت کی حیثیت زیادہ تر نمائشی ہوتی ہے اور اصل اختیارات وزیراعظم ہی کے پاس ہوتے ہیں، اس لئے دنیا بھر کے نزدیک وزیراعظم ہی کو اصل سربراہ سمجھا جاتا ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت تھانوی قدس سرہ عورت کی سربراہی کو ہرگز جائز نہیں سمجھتے جس کیلئے ان کی صریح تحریریں موجود ہیں البتہ سوال یہ تھا کہ جمہوری حکومت کی سربراہی حقیقی سربراہی ہے یا نہیں؟

اس سوال کا تعلق شریعت کی تحقیق سے نہیں بلکہ مروجہ جمہوری نظام کی تحقیق سے ہے، اور ظاہر ہے حضرت تھانوی کا اصل موضوع شریعت کی تحقیق تھا، عہد حاضر کے سیاسی نظاموں کی تحقیق حضرت تھانوی قدس سرہ کا موضوع نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ پارلیمانی نظام کے وزیراعظم کے سلسلے میں جو حقائق اوپر بیان کئے گئے ہیں اگر وہ حضرت تھانوی قدس سرہ کے سامنے لائے جاتے تو وہ اپنی اس رائے پر ضرور نظر ثانی فرماتے کہ محض وہ ایک رکن مشورہ ہے۔

تاریخ کی بعض مثالیں:

بعض لوگ عورت کی سربراہی کے جواز میں بعض تاریخ کی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ فلاں فلاں مواقع پر فلاں عورت برسرِ اقتدار رہی ہے لیکن ظاہر ہے کہ تاریخ میں جائز و ناجائز ہر قسم کے واقعات ہوئے ہیں یہ واقعات دین میں کوئی سند نہیں ہیں، سند قرآن و سنت ہیں۔ لہذا اگر کہیں اکادکا کچھ واقعات عورت کی سربراہی کے پیش آئے ہیں تو ان کی بنیاد پر قرآن و سنت کے واضح احکام اور دلائل کو چھوڑا نہیں جاسکتا پھر ان اکادکا واقعات کی اکثریت ایسی ہے جہاں مسلمانوں نے ایسی حکومت کو گوارا نہیں کیا یہاں تک کہ وہ حکومت ختم ہو گئی اور ان حکومتوں کے دور میں بھی کہیں نہیں ملتا کہ کسی فقیہ یا عالم نے عورت کی سربراہی کے جواز کا فتویٰ دیا ہو۔

اسی ضمن میں بعض لوگ مس فاطمہ جناح کے صدارتی امیدوار بننے کو سند میں پیش کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ملک کا کوئی عالم ہمارے علم میں نہیں ہے جس نے اس اقدام کی حمایت کرتے ہوئے یہ کہا ہو کہ عورت حکومت کی سربراہ ہو سکتی ہے، لہذا اس واقعے کو دلیل میں پیش کرنا خلطِ محبت کے سوا کچھ نہیں۔

تمام مکاتب فکر کے پاکستانی علماء کا فیصلہ :

بہر کیف! عورت کی سربراہی کا ناجائز ہونا ایک ایسا مسلمہ مسئلہ ہے جو قرآن و سنت کے واضح ارشادات اور اجماع امت پر مبنی ہے۔ امت کے کسی ایک فقیہ یا عالم نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔

اسی لئے ۱۹۵۱ء میں جب پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے علماء نے کراچی میں آئینی مسائل پر اجتماع منعقد کیا جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور شیعہ تمام مدرسہ ہائے خیال کے چوٹی کے ۳۳ حضرات موجود تھے، اور مشہور متفقہ بائیس نکات طے کئے جو ان کے نزدیک پاکستان کے آئین کیلئے بنیادی اہمیت رکھتے تھے، تو ان میں بارہواں نکتہ یہ تھا:

”رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت

اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو“

ان بائیس نکات پر پاکستان کے ہر مکتب فکر کے تمام علماء متفق ہیں اور آج تک ان میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔

لہذا کسی اسلامی حکومت میں عورت کو سربراہ بنانا ہرگز جائز نہیں ہے اور اگر کہیں ایسا ہو جائے تو مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ جلد از جلد سربراہی کی تبدیلی کیلئے ممکنہ کوششوں کو بروئے کار لائیں۔ واللہ سبحانہ الموفق
محمد رفیع عثمانی

الجواب صحیح

حضرت مولانا طہر نعیمی صاحب مدظلہم حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم

حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب مدظلہم حضرت مولانا سلیم اللہ صاحب مدظلہم

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب مدظلہم

بطور احتجاج پتلا جلانا

بطور احتجاج پتلا جلانا

موضوع: ”پتلا جلانا گناہ ہے“

مکرمی جناب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

وزارت داخلہ نے اپنے مراسلہ نمبر ۱۱/۳۰۱/۲۰۰۱ پیلک مورخہ ۲۰ نومبر ۲۰۰۱ء ایک اخباری تراشہ بعنوان ”پتلا جلانا گناہ ہے“ منسلک کرتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل سے اس سلسلے میں ضروری کارروائی کی استدعا کی ہے۔

اس زمانے میں احتجاج اور اظہار نفرت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ شخصیت جس کے خلاف احتجاج، یا جس سے اظہار نفرت مقصود ہوتا ہے اس کا ایک پتلا سا بنا لیا جاتا ہے جسے Effigy کہتے ہیں اور اسے مظاہرین غوام کے سامنے نذر آتش کر دیتے ہیں۔

یکم نومبر ۲۰۰۱ء کے دی نیوز اخبار میں ایس ایس بخاری نے عندیہ دیا ہے کہ اسلام میں جاندار اشیاء کا پتلا یا شبیہ وغیرہ بنانا خواہ وہ مٹی سے بنا ہو، کپڑے یا دھاگے سے یا کاغذ سے، بت گری کے مترادف ہے جو شرک ہے اور گناہ کبیرہ ہے۔ مزید برآں پتلا جلانا ہندوؤں کے مردہ جلانے کی رسم کی سرپرستی کرنا ہے جبکہ مسلمانوں کے ہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہے۔

اس صورت حال کے بارے میں شرعی نقطہ نظر سے آپ کی رائے مطلوب

ہے۔ امید ہے کہ آپ ایک ہفتہ کے اندر اپنی رائے ارسال فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

والسلام

نیاز کیش

(ڈاکٹر غلام مرتضیٰ آزاد)

ڈائریکٹر جنرل (ریسرچ)

اسلامی نظریاتی کونسل۔ اسلام آباد

الجواب حامداً ومصلیاً:

..... پتلا بنانا: اس کے بارے میں تفصیل درج ذیل ہے:

اگر یہ پتلا اس طریقہ سے بنایا جاتا ہو کہ اس کا باقاعدہ سر ہو، اور اس میں آنکھیں، کان وغیرہ واضح طور پر بنے ہوئے ہوں، خواہ یہ اعضاء پٹیل یا قلم سے کیوں نہ بنائے گئے ہوں، تو یہ پتلا بنانا بلاشبہ بت گری کے حکم میں ہے، سخت گناہ ہے، اور ناجائز ہے، جس سے اجتناب بہر حال ضروری ہے۔ خواہ کسی سے محبت کی غرض سے بنایا جائے، یا نفرت کی غرض سے، نیز خواہ رکھنے اور محفوظ رکھنے کے لئے ہو، یا جلانے اور ضائع کرنے کیلئے ہو، احادیث مبارکہ میں اس کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں، اور اس کی حرمت اور ناجائز ہونے میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔

لیکن اگر پتلا اس قسم کا ہو، کہ اس کا صرف دھڑ ہو، اور سر بالکل نہ ہو، یا سر ہو، لیکن برائے نام ہو، یعنی اس میں کان، آنکھ، ناک، منہ نہ ہوں، تو اس صورت میں اس کا بنانا بت یا تصویر کے زمرے میں نہیں آتا۔

ہم نے اس سلسلہ میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کی روشنی میں ان

مظاہروں میں جو پتلے بنائے جاتے ہیں، وہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں، بعض میں صرف دھڑ بنے ہوئے ہوتے ہیں، اور سریا تو ہوتا ہی نہیں، یا برائے نام ہوتا ہے، اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں سر ہوتا ہے، اور اس میں اعضاء منہ، ناک وغیرہ بنے ہوئے ہوتے ہیں، مذکورہ بالا تفصیل کی رو سے پہلی قسم تصویر اور بت گری میں داخل نہیں، اور دوسری قسم تصویر اور بت گری میں داخل ہے، جس سے بچنا بہر حال ضروری ہے۔ (شرعی دلائل اس تحریر کے آخر میں درج ہیں)

۲..... پتلا جلانا: اور جہاں تک پتلا جلانے کا معاملہ ہے، تو اسے ہندوؤں کی رسم کی سرپرستی کہنا تو اس لئے مشکل ہے کہ وہ مردے کو اپنی مذہبی رسم کی بناء پر جلاتے ہیں، جس کا مقصد بظاہر اس مردہ کی تکریم ہے، جیسا کہ ہمارے ہاں تدفین ہے، برخلاف پتلے کے جلانے کے، کہ اسے مذہبی رسم کے طور پر جلایا نہیں جاتا اور نہ اس کا منہ اس پتلے کی تکریم ہے، بلکہ یہاں تو اس عمل کا منشاء اس شخص سے نفرت ہے، جس کا یہ پتلا جلایا جا رہا ہے، البتہ اس عمل کے شرعاً عدم جواز کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس پتلے کے جلانے کے تین یا ان میں سے ایک مقصد ہو سکتا ہے، یا تو یہ عمل اس عزم کا اظہار ہے کہ جس شخص کا یہ پتلا ہے کہ اگر وہ شخص ہمارے ہاتھ آگیا، تو ہم اسکو اس طرح جلائیں گے، یا اس تمنا کا اظہار ہے کہ اگرچہ ہم اس کو جلانہ سکیں، لیکن دوسرے لوگ اس کو جلائیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عزم اور تمنا کا شرعی حکم کیا ہے؟ تو اس میں یہ بات واضح رہنی ضروری ہے کہ احادیث مبارکہ میں کسی جاندار کی سزا دینے کی ممانعت آئی ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

وان النار لا يعذب بها الا الله (بخاری شریف کتاب

الجهاد)

”اور آگ کے ذریعہ سزا صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے“

ایک اور ارشاد ہے:

لا تعذبوا بعذاب الله (حوالہ بالا)

”جو عذاب اللہ کے ساتھ خاص ہے، وہ کسی کو نہ دو“

تو جب کسی جاندار کو خواہ وہ کافر کیوں نہ ہو، جلاسنے کی سزا دینا شرعاً جائز نہیں، تو اس ناجائز کام کی نیت یا تمنا کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔

پتلا جلانے کا تیسرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ محض اس شخص سے نفرت کا اظہار ہو، اسے زندہ جلانے کے ارادے یا تمنا کا اظہار مقصود نہ ہو، مگر نفرت کا یہ اظہار چونکہ ایک ایسے عمل سے کیا جاتا ہے، جو ایک ناجائز عمل (آدمی کو جلاسنے) کی تمثیل ہے، لہذا یہ بھی ناجائز ہوگا، کیونکہ ناجائز عمل کی تمثیل بھی شرعاً ناجائز ہے۔ ردالمحتار میں علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وانما قال في الدرر: اذا شرب الماء وغيره من المباحات

بلهو وطرب على هيئة الفسقة حرام اهـ، والاقرب لقواعد

مذهبننا عدم الحيل، لان تصور تلك الاجنبية بين يديه يظفرها،

فيه تصوير مباشرة المعصية على هيئتها..... حدیث:

”اذا شرب العبد الماء على شبه المسكر كان ذلك عليه

حرما“ (۳۷۲/۶)

پتلے بنانے سے متعلق شرعی دلائل درج ذیل ہیں:

(۱) معانی الآثار میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ذکر کی

ہے کہ:

(۲) وفي البدائع: فان كانت مقطوعة الرؤس فلا بأس

بالصلاة فيها، لانها بالقطع خرجت من ان تكون تماثيل.

والتحقت بالنقوش. (۱/۱۹۶ مكروهات الصلاة)

(۳)..... فی خلاصة الفتاوى: وكذا لو محى وجه

الصورة فهو قطع الرأس ۱هـ (۵۸/۱)

(۴)..... فی رسالة بلوغ القصد والمرام لشيخ الاسلام

جعفر الكتاني المالكي:

ولو فقد القيد الثاني بان كانت غير كاملة الاعضاء الظاهرة

التي لا يعيش الحيوان بدونها كما لو كانت مقطوعة الرأس

او النصف جازت لذهاب الصورة المعتبرة شرعاً وزوال

هيئتها الممنوعة.

(۵)..... وفي عمدة القارى: وفي التوضيح: قال

اصحابنا وغيرهم: تصوير صورة الحيوان حرام اشد

التحريم وهو من الكبائر وسواء صنعه لما يمتن او لغيره

فحرام بكل حال لان فيه مضاهات بخلق الله الخ

(۷۰/۲۲)

(۶)..... وفي شرح النووي: قال اصحابنا وغيرهم من

العلماء: تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو

من الكبائر لانه متوعد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور

في الاحاديث وسواء صنعه بما يمتن او بغيره فصنعه حرام

بكل حال لان فيه مضاهات بخلق الله الخ (۱۹۹/۲)

(۷)..... مفتي اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتي محمد شفیع کے رسالہ

”تصویر کے شرعی احکام“ میں ہے:

”البتہ روایات حدیث کی تصریحات اور عام کتب حنفیہ کی عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناقص تصویر جس میں سر نہ ہو، تصویر کے حکم میں نہیں رہتی، بلکہ نقوش اور نیل بوٹوں کے حکم میں ہو جاتی ہے، اور اس بنا پر اس کے استعمال کی اجازت سب کتب مذہب میں عام طور سے مصرح ہے، اس سے ظاہر یہی ہے کہ اس تصویر کے بنانے کا بھی وہی حکم ہو گا جو نیل بوٹے اور عام نباتات کی تصویر بنانے کا ہے۔“ (ص ۶۵)..... واللہ تعالیٰ اعلم

محمد رفیع عثمانی

رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

۱۴/۱۰/۲۲ھ

دینی جماعتیں

اور

موجودہ سیاست

مفتی محمد رفیع عثمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اس وقت عالم اسلام کو عموماً اور پاکستان کو خصوصاً جن سلگتے مسائل اور سنگین صورت حال کا سامنا ہے ان سے ملک و ملت کا ادنیٰ در در کھنے والا ہر مسلمان ایسے کرب اور بے چینی میں مبتلا ہے جس میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے، اسی کرب اور بے چینی نے یہ جرات پیدا کی کہ اپنی دینی سیاسی جماعتوں کی خدمت میں محض ”الدین النصیحة“ (دین صرف خیر خواہی ہے۔ الحدیث) کی بنیاد پر کچھ گذارشات پیش کی جائیں۔

آج کے سارے مسائل کی جڑ یہ المیہ ہے کہ عوام اپنی دینی قیادت سے مایوس اور محروم ہو گئے ہیں، یا کر دیئے گئے ہیں۔ اس المیہ کی تہ میں جہاں دشمنوں کی سازشیں کار فرما رہی ہیں، اپنوں کی سادگی، باہمی فاصلوں اور وسعت قلب و نظر کی قلت نے بھی اپنا اثر دکھانے میں کمی نہیں کی۔

”ملی یکجہتی کو نسل“ بلاشبہ ایک امید افزا اتحاد ہے، کیونکہ مسلکی اور جماعتی تعصبات ہی کا سنگ گراں ہر قدم پر نفاذ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا ہے، اس سنگ گراں کو چور چور کئے بغیر ہمارا کوئی قدم اسلامی معاشرے کے قیام اور نفاذ اسلام کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ اس کے بغیر ہم عوام کو کوئی

قیادت فراہم کر سکتے ہیں نہ ان کا اعتماد دینی قیادت پر بحال ہو سکتا ہے، ”اگر ملی یکجہتی کو نسل“ اس سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے اثرات دور رس اور ٹھوس ہوں گے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم اس اجتماعی گناہ کبیرہ سے بچ جائیں گے جس کے ہم افتراق باہمی اور تفرقہ امت کی صورت میں برسوں سے مرتکب ہو رہے ہیں، اور اس فرض منصبی کو ادا کرنے کی قابل ہو سکیں گے جس پر ملک و ملت کے تقریباً سارے مسائل کا حل ایک عرصے سے موقوف چلا آ رہا ہے۔

لیکن اس وقت جب کہ ملک پھر ایک دور اپنے پر آکھڑا ہوا ہے، یہ صورت حال معنی خیز ہے کہ ”ملی یکجہتی کو نسل“ منظر سے غائب یا اوچھل ہوئی جا رہی ہے، اور اس میں شامل دینی سیاسی جماعتیں اپنی اپنی پالیسیوں کا اعلان اس طرح کر رہی ہیں جیسے ”ملی یکجہتی کو نسل“ کا وجود تحلیل ہو چکا ہو!

اگرچہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کو نسل کے بارے میں کچھ ذہنی تحفظات بھی شروع سے پائے جاتے ہیں، جیسا کہ آگے عرض کیا جائے گا، تاہم وہ اب بھی امید کی ایک کرن ضرور ہے جسے بھانے کے بجائے ملک و ملت کے لئے مشعل راہنہ کی ضرورت ہے۔

پچھلے انتخابات کا جو سنگین اور زہر آلود نتیجہ اسلام اور پاکستان کو ملا ہے اس کا لاری زخم روز بروز زیادہ گہرا اور گھائل ہوتا جا رہا ہے، اس کے منطقی اثرات جس بولناک رفتار سے ملی زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں، اسے کہ نئے انتخابات تک یہ لاعلاج ہو کر نہ رہ جائے۔

پچھلے انتخابات سے اب تک جتنے مختلف دینی اور پاکستانی ذہن اور ملک و ملت

کے لئے درد مندانه سوچ رکھنے والے وسیع تر حلقوں کے تاثرات ناچیز کے علم میں آئے وہ سب اس کی ذمہ داری بڑی حد تک ہماری دینی سیاسی جماعتوں پر ڈالتے ہیں۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ اس سے پہلے کے بار بار انتخابات میں اگر وہ ان جماعتوں کی بصیرت پر شاکی تھے تو اب وہ ان کی، یا ان کی قیادت کی نیک نیتی کو زیر بحث لاتے ہیں، عالم بے چارگی میں یہاں تک کہا جانے لگا ہے کہ ”کہیں ہماری ساری سیاسی و دینی جماعتیں بالواسطہ یا بلاواسطہ، دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام دشمن عالمی طاقتوں کی آلہ کار تو نہیں بن گئیں“!

یہ خطرہ پھر شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ یہ جماعتیں افتراق و انتشار کا شکار ہو کر پچھلے کی طرح آنے والے انتخابات میں بھی سیکولر محاذ کے مقابلے میں پڑنے والے ووٹوں کی تقسیم کا باعث نہ بن جائیں، اور اس مرتبہ پھر ”اشد البلیتین“ (دو ناگزیر برائیوں میں سے شدید تر برائی) کی صورت میں وہی سنگین نتیجہ مزید ہولناکیوں کے ساتھ لاعلاج بن کر مسلط نہ ہو جائے۔

”ملی یکجہتی کو نسل“ جو بنیادی طور پر ان ہی جماعتوں اور تنظیموں پر مشتمل ہے، اس کا قیام ایک طرف عوام اور دینی حلقوں کے لئے خوشگوار حیرت کا باعث اور امید کی ایک کرن بن کر سامنے آیا تو دوسری طرف یہ ”دودھ کے جلے“ عوام اور دینی حلقے ”چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پینے“ کے طبعی اصول پر کچھ ذہنی تحفظات کے شکار ہیں۔ یہ خطرہ بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ ”ملی یکجہتی کو نسل“ باقی تو رہے، لیکن حقیقتاً تیسری مستقل اور فیصلہ کن طاقت بنے بغیر ہی، وہ موجودہ دو بڑی سیاسی قوتوں کے مقابلے میں اپنا تیسرا محاذ کھول دے۔ اس صورت میں بھی وہی سنگین نتیجہ لاعلاج بن کر برآمد ہو گا جس سے نکلنے کے لئے پورا ملک بے چین ہے، ووٹ پھر تقسیم ہو جائیں گے۔

اللہ وہ روز بد کبھی نہ دکھائے، لیکن خدا خواستہ پھر ایسا ہوا تو پاکستان کی رہی سہی آزادی، اور رہی سہی دینی اقدار کا کیا حلیہ سہنے گا؟ اس کا تصور ہی اتنا بھی ایک اور اذیت ناک ہے کہ کم از کم ناچیز میں اسے زبان و قلم پر لاسنے کی سکت نہیں۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ کراچی سمیت ملک و ملت کے جملہ مسائل کی کلید دینی قوتوں کا متحد ہو کر اپنے ملی فرائض منصبی کو ادا کرنا ہے، ”ملی یکجہتی کو نسل“ اس سلسلے میں ایک امید افزا پیش رفت نظر آتی تھی، اسے نہ صرف استحکام ملنا چاہئے بلکہ ان خدشات کو بھی دور کرنا چاہئے جن کا اشارہ اوپر کیا گیا۔

پچھلے انتخابات تک مسئلہ نفاذ شریعت کا تھا، لیکن اب نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں جو کچھ ۲۸ سال میں حاصل کیا گیا تھا وہ چکنا چور ہوتا نظر آ رہا ہے، بلکہ پاکستان کی آزادی ہی مشکوک ہو کر رہ گئی ہے، اور بعض باخبر حلقوں کے ان تبصروں میں بہت زیادہ مبالغہ نظر نہیں آتا کہ ”ہم آزادی سے ہاتھ دھو چکے ہیں جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے از سر نو جدوجہد کرنی ہوگی۔“

نئے انتخابات جلد ہوں یا بدیر، ہماری دینی سیاسی جماعتوں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ عوام اور دینی قیادت میں وہ ربط و ضبط اور باہمی اعتماد کیوں باقی نہیں رہا جو تقریباً بیس پچیس برس پہلے تک نمایاں طور پر موجود تھا؟ عوام پر اس دینی قیادت سے مایوسی کیوں طاری ہو گئی ہے جو ملکی اور ملی سطح پر صدیوں سے ان کی رہنمائی کرتی چلی آئی ہے، اور جس کے ہر فیصلے پر وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے؟ اگر ان جماعتوں کے مقاصد برحق، اور طریقہ کار بھی برحق ہے تو اللہ رب العالمین کی نصرت و حمایت کا وعدہ کیوں پورا نہیں ہو رہا؟ اس تشویشناک صورت حال کے اسباب کا کھوج لگا کر آئندہ کا

لائحہ عمل صحیح طور پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

ناچیز کو سیاسی تنظیمی میدان عمل کا کوئی قابل ذکر تجربہ نہیں، اور جو کچھ تھا بھی اسے انقلاب حالات نے کالعدم کر دیا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں چند گذارشات جو اصولی طور پر ناچیز کی نظر میں بہت واضح ہیں، سپرد قلم کرتا ہوں، اس عزم کے ساتھ کہ جو بات ناچیز حق سمجھتا ہے اس کے اظہار میں کسی قسم کے تحفظات کو حائل نہ ہونے دے، اس امید کے ساتھ کہ اس اظہار کو مخلصانہ، دردمندانہ اور برادرانہ اداء فرض ہی سمجھا جائے گا۔ یہ گذارشات ہماری دینی سیاسی جماعتوں اور ”ملی یکجہتی کونسل“ کے لئے ناچیز کے نزدیک بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، ان کے بغیر ہماری ان جماعتوں کا عوام سے رابطہ بحال ہو سکے گا نہ ان کا اعتماد واپس آ سکے گا، اور نہ کسی بھی منصوبے اور لائحہ عمل کے پائیدار اور بار آور ہونے کی قوی امید کی جاسکے گی۔

۱- ان شبہات اور اندیشوں کا ازالہ بہر کیف ضروری ہے جن کی طرف پیچھے اشارہ کیا گیا۔

۲- ہماری دینی سیاسی جماعتوں کا متحدہ پلیٹ فارم (مثلاً ملی یکجہتی کونسل) ہو، یا ان کا اپنا اپنا میدان عمل، ہر صورت میں شرعی احکام کی پابندی ان کا طغرائے امتیاز ہونا چاہئے، اعلیٰ قیادت سے لیکر ادنیٰ کارکن کی یہ بنیادی اور سب سے پہلی ضرورت ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ باطل پر اہل حق کی فتح و نصرت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے دوشروٹوں کے ساتھ فرمایا ہے، ایک اخلاص، کہ نیت صرف خدمت ملک و ملت اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، دوسری یہ کہ عمل شرعی حدود کا پابند ہو، ان میں سے کسی ایک شرط کا

فقہ ان اللہ تعالیٰ کی امداد سے محرومی کا باعث بن سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ لکھ کر حضرات اہل علم کی معلومات میں ناچیز ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں کر رہا، لیکن ان کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مجاشر سے کی دوسرے حلقوں کی طرح ہماری سیاست بھی ان دوشروٹوں کو پورا نہیں کر رہی، بلکہ میدان سیاست تو کچھ زیادہ ہی ”سیکولر“ ہو گیا ہے، جس کے زہریلے اثرات سے ہماری دینی جماعتیں بھی محفوظ نہیں رہیں، اس مشہور جملے کے پہلو بہ پہلو کہ ”سیاست میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی“ یہ جملہ بھی دینی سیاسی جماعتوں کے حضرات سے بکثرت سننے میں آنے لگا ہے کہ ”سیاست میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے“! ہماری ان جماعتوں کے کارکنوں میں دینی احکام سے ناواقفیت میں اضافہ ہو رہا ہے، اور سیاسی میدان میں مجموعی طور پر ان کا طرز عمل سیکولر جماعتوں سے زیادہ مختلف نہیں رہا، ان جماعتوں کا دینی تشخص روز بروز مضمحل ہوتا جا رہا ہے، نہایت دکھ سے عرض کرتا ہوں۔ اور خود کو اور بھی زیادہ قصور وار سمجھتے ہوئے عرض کر رہا ہوں، کہ بسا اوقات تو یوں لگتا ہے کہ ہمارا دینی تشخص صرف نام اور ظاہری وضع قطع تک محدود ہو گیا ہے۔ مخلصانہ دینی اخلاق و کردار نہ ہماری سیاسی پالیسیوں اور تحریکوں میں واضح یا غالب عنصر کے طور پر نظر آتا ہے نہ تقریروں اور اخباری بیانات میں، فریق مخالف کو ”جب چاہو، جو چاہو اور جس طرح چاہو“ کہہ دینے کا رواج تو یوں لگتا ہے کہ قرآن و سنت کی قائم کردہ تمام حدود سے سبے نیاز ہو چکا ہے، دین پر مسلکوں اور جماعتوں کی، اور شرعی احکام پر سیاسی مصلحتوں کی بالادستی قائم ہوتی جا رہی ہے، جبکہ مسلکی، جماعتی اور سیاسی مصالح اگر دینی احکام کے پابند نہ رہیں تو بقول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ ”مصلح“ کے بجائے ”مسالے“ بن جاتے ہیں جن کو پیسا جانا ہی

ضروری ہے۔

ان حالات میں ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ مذکورہ بالا ناگفتہ بہ صورت حال کی اصلاح اور اپنے کارکنوں کی بقدر ضرورت دینی تعلیم و تربیت کے لئے ٹھوس اور موثر لائحہ عمل تشکیل دیں، اور اس پر اپنی بھرپور توجہ مبذول فرمائیں، کہ دین اور تعلق مع اللہ ہی اصل قوت ہے، اس کے بغیر ہم کچھ نہیں۔ ایسی مجلسیں بھی موقع بہ موقع ہوتی رہنی چاہئیں جن میں باہمی وعظ و تذکیر، خشیت و للہیت، صبر و تقویٰ، انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام اور بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات سے اور سنائے جائیں، حب مال، حب جاہ، ریاء اور شہرت طلبی جیسے تباہ کن رذائل کی مذمت، اور ان کی شرعی حدود کا بیان ہو، اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایثار و قربانی اور تواضع و توکل کے فضائل کا تذکرہ قرآن و سنت کی روشنی میں ہوتا رہے، بلکہ ہماری کوئی مجلس ان تذکروں اور اللہ کے ذکر سے خالی نہ رہے۔

اس وقت یوں تو ہمارا سامنا بظاہر اپنوں سے ہے، لیکن ان سنگین حقیقت سے آپ یقیناً مجھ سے زیادہ باخبر ہوں گے کہ مقابلہ در حقیقت ہنود و یہود سے پیش آگیا ہے، ہنود سے براہ راست اور یہود سے بالواسطہ، ان دونوں کے بارے میں قرآن حکیم کا یہ ارشاد دور تک کی صورت حال بتا دینے کے لئے کافی ہے کہ:

﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾

”مسلمانوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی رکھنے والے آپ یہودیوں اور مشرکین کو پائیں گے“ (سورۃ المائدہ: ۸۲)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دشمن سے مقابلے کے لئے جگہ جگہ تفصیلی اور جزوی ہدایات بھی دی ہیں جو اہل علم کی نظر سے مخفی نہیں ہو سکتیں، اور سورۃ الانفال کی تین آیات میں ایک جامع اصولی ہدایت نامہ دیا ہے، ناچیز نے اوپر کا مشورہ ان ہی کی روشنی میں پیش کیا ہے، وہ آیات یہ ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا، إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ، وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ﴾

”اے ایمان والو! جب تمہارا (کافروں کی) کسی جماعت سے مقابلہ ہو تو (۱) ثابت قدم رہو، اور (۲) اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ، اور (۳) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیا کرو، اور (۴) آپس میں نزاع مت کرو، ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور (۵) صبر کرو، بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اور (۶) ان (کافر) لوگوں کے مشابہ مت ہو جانا جو اپنے گھروں سے اترتے ہوئے اور لوگوں کے دکھاوے کے لئے نکلے“

(سورۃ الانفال: ۴۵-۴۷)

موجودہ حالات میں ہماری سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کے اس چھ نکاتی ہدایت نامے کے ہر ہر نکتے کو سامنے رکھ کر اپنا احتساب کریں۔ اس ہدایت نامے میں ان تمام چیلنجوں اور سوالات کا اصولی اور بنیادی حل موجود ہے جو ہمیں درپیش ہیں، دینی قیادت پر عوام کا اعتماد بھی اس

حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ کو ساتھیوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تو کوئی اور شخص یا تنظیم اس سے کیسے بے نیاز ہو سکتی ہے؟ قرآن حکیم کی ایک بڑی سورت کا نام ہی ”الشوریٰ“ ہے، اس سورت میں سچے مسلمانوں کا ایک اہم وصف یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ﴾

”اور ان کا ہر اہم کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے“

(سورۃ الشوریٰ: ۳۸)

جب وہ آیت جس میں آنحضرت ﷺ کو مشورہ لینے کی تلقین فرمائی گئی ہے نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”أَمَّا إِنَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ غَنِيَانِ عَنْهَا، وَلَكِنْ جَعَلَهَا اللَّهُ رَحْمَةً لِّلْأُمَّتِیْ، فَمَنْ شَاوَرَ مِنْهُمْ لَمْ يُعْذَمْ رُشْدًا، وَمَنْ تَرَكَ الْمَشْوَرَةَ مِنْهُمْ لَمْ يُعْذَمْ عَنَاءٌ“

”اللہ اور اس کے رسول کو مشورے کی حاجت نہیں، لیکن اللہ نے اسے میری امت کے لئے ایک رحمت بنایا ہے، پس ان میں سے جو شخص مشورے کرے گا وہ (بہتر کام کی) ہدایت سے محروم نہ رہے گا، اور جو شخص مشورہ لینا چھوڑ دے گا وہ مشقت سے نہ بچ سکے گا“

(بیہقی شعب الایمان - حدیث ۷۵۴۲)

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

”إِذَا كَانَ أَمْرَاءُكُمْ خِيَارَكُمْ، وَأَغْنِيَاءُكُمْ، سَمَحَاءُكُمْ،

وَأُمُورُكُمْ شُورَى بَيْنَكُمْ، فَظَهَرَ الْأَرْضَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ بَطْنِهَا، وَإِذَا كَانَ أَمْرَاءُكُمْ شِيَارَكُمْ، وَأَغْنِيَاءُكُمْ، وَبُخْلَاءُكُمْ، وَأُمُورُكُمْ إِلَى نِسَائِكُمْ، فَبَطْنُ الْأَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا“

”جب تمہارے حکام تم میں کے بہترین افراد ہوں، اور تمہارے مالدار سخی ہوں، اور تمہارے اہم معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہوں تو زمین (پر زندہ رہنا) تمہارے لئے اس کے پیٹ (قبر) سے بہتر ہے، اور جب تمہارے حکام تم میں کے بدترین افراد ہوں، اور تمہارے مالدار بخیل ہوں، اور تمہارے اہم معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں، تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پشت سے بہتر ہے“

المیہ یہ ہے کہ اس وقت ہم اس حدیث کے آخر میں بیان کی گئی سنگین صورت حال سے بڑی حد تک دوچار ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے اپنی پناہ عطا فرمائے۔

ساتھیوں سے مشورہ لئے بغیر بڑے اور اہم اقدامات کر ڈالنے کا جذبہ محرکہ یا تو اپنی رائے کی صحت پر حد سے بڑھا ہوا اعتماد ہو تا ہے جسے دوسری احادیث میں ”اعجاب برأیہ“ فرمایا گیا ہے۔ یا تنہا کریڈٹ لینے کا شوق ہو تا ہے یہ ”ریاء و شہرت طلبی“ میں داخل ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

”مَنْ لَبَسَ ثَوْبَ شَهْرَةِ الْبَيْسَةِ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ“

”جو شخص شہرت کا لباس پہنے گا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت

کا لباس پہنائے گا“ (ابن ماجہ ص ۲۶۶، ابوداؤد، ومسنن احمد)

یا اس کا سبب جلد بازی کی عادت ہوتی ہے، قرآن و سنت میں ان تینوں ردائل کی جو مذمت آئی ہے محتاج بیان نہیں۔

معاف فرمایا جائے، اس نکتے پر زیادہ زور اس لئے دینا پڑا کہ ناچیز کی دلی تمنا ہے اور دعاء بھی، کہ ”ملی یکجہتی کو نسل“ بھی اسی سانچے سے دوچار نہ ہو جائے جس کا پچھلے کئی اتحاد شکار ہو چکے ہیں۔

۶۔ کسی ناپسندیدہ اور بد عنوان حکومت کو محض گرا دینا بذات خود کوئی معقول کارنامہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ متبادل بہتر حکومت کا کم از کم بنیادی خاکہ اور اس کے قوی امکانات فراہم نہ کر لئے جائیں، اور اس کے لئے ہم خیال ناگزیر سیاسی قوتوں کو ضروری حد تک اعتماد میں نہ لے لیا جائے، کہ اقتدار کا خلاء منٹوں سے زیادہ نہیں رہا کرتا۔ اگر مذکورہ بالا ”ہوم ورک“ کے بغیر کسی بد عنوان اور سیہ کار حکومت کو گرانے میں کامیابی حاصل کر بھی لی جائے تو یہ بات بعید از قیاس نہیں ہوگی کہ ہمارے دشمن اس سے بھی بدتر ہتھوڑے باز اقتدار مسلط کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

یہ نکتہ اصولی طور پر اتنا واضح ہے کہ اسے ”نکتہ“ کہنا بھی تکلف ہی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس پر زور دینے کی ضرورت اس لئے پیش آرہی ہے کہ ماضی میں بعض تحریکیں چلاتے وقت یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ”ہمارا مقصد“ فی الحال“ صرف موجودہ بے دین اور ظالم حکومت سے خلاصی پانا ہے، متبادل حکومت کے بارے میں ہم نے اس لئے نہیں سوچا کہ جو حکومت بھی آئے گی وہ بہر حال اس سے بہتر ہوگی۔“ یہ ادھور اطرز فکر، جو صرف منفی جذبات پر مشتمل اور مثبت تعمیری سوچ سے یکسر خالی ہے، کسی عام آدمی کا ہوتا تب بھی قابل اصلاح تھا، لیکن ناچیز کے

گتھ گار کانوں نے یہ استدلال جنرل ایوب خان کے خلاف چلائی جاسنہ والی ہمہ گیر تحریک کے موقع پر اس کے ایک صف اول کے رہنما سے، جو اللہ کے فضل سے بقید حیات ہیں۔ تبادلہ خیالات کی ایک مجلس میں خود سنا تھا۔ ظاہر ہے یہ ادھوری حکمت عملی دانش و تدبیر کے لازمی تقاضوں کو پورا کرتی ہے نہ دینی اور ملی تقاضوں کو، ماضی کے تلخ و سنگین تجربات بھی اس کی تباہ کاریوں سے سبق لینے کے لئے کافی ہیں۔

مفلوج گورنر جنرل غلام محمد نے اسی ادھوری حکمت عملی پر مبنی ایک زبردست دینی تحریک سے، جس میں ہزاروں مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا، شاطرانہ فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی حکومت اور مولوی تمیز الدین خان کی دستور ساز اسمبلی کو توڑ کر ملک کو پٹری سے اتار اٹھا، اس نے اپنا ذاتی راج قائم کر کے نہ صرف ملک میں امریکی تسلط کا راستہ ہموار کیا، بلکہ دینی سیاسی قوتوں کو انتہائی بے رحمی سے توڑ مروڑ کر ختم نبوت جیسے مقدس اور اساسی مسئلہ کو پورے بیس سال پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اور جب نئی کابینہ وجود میں آئی تو قادیانی وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اس میں بھی موجود تھا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہ وہی وزیر خارجہ تھا جسے ہٹانے کے لئے خواجہ ناظم الدین کے خلاف تحریک چلائی گئی تھی۔

جنرل ایوب خان کے خلاف بھی اسی طرح کی ناکافی حکمت عملی پر مبنی تحریک سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر قوم کی گردن پر جنرل یحییٰ خان مسلط ہوا تھا جس نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر ملک ہی کو دو لخت کر ڈالا۔

غرض! ہماری دینی سیاسی تنظیمیں اور جماعتیں غلط کار و ناپسندیدہ حکومتوں کو

گرنے میں تو ہر اول دستے کا کردار ادا کرتی رہی ہیں، بلکہ پاکستان میں کسی حکومت کو گرنے میں کوئی بھی سیاسی قوت ان کی حمایت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکی، یہ بات بلاشبہ پاکستان میں دینی قوتوں کی فیصلہ کن حیثیت کی اب بھی واضح نشان دہی کرتی ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کی کئی تحریکوں سے، جن کے مقاصد بھی بڑے نیک تھے، طالع آزمائوں اور عالمی اسلام دشمن طاقتوں ہی نے فائدہ اٹھایا ہے، جس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ تحریک شروع کرنے سے پہلے وہ ”ہوم ورک“ نہ کیا جا سکا تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اب جبکہ ملک پھر ایک سیاسی دور اپنے پر دکھائی دے رہا ہے، ہماری دینی سیاسی جماعتوں نے خدا کرے وہ کرنے کا کام کر لیا ہو جس کے آثار۔ افسوس بلکہ تشویش ہے کہ نظر نہیں آرہے۔

۷۔ جب تک ”ملی یکجہتی کونسل“ یا دینی جماعتوں کا کوئی اور متحدہ پلیٹ فارم ایک فیصلہ کن، ملک گیر، حقیقی اور مستقل قوت نہیں بن جاتا (جس کے لئے ابھی خاصا وقت اور حکیمانہ، صبر آزما مسلسل جدوجہد درکار ہے) اس وقت تک کے عبوری دور میں حسب ضرورت دوسری سیاسی قوتوں سے وقتی تعاون لینے اور کرنے، یا بعض اہم مواقع پر ان کے ساتھ اتحاد کی ضرورت پیش آتی رہے گی، ایسی صورت میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جانا دینی مقاصد کے لئے بہر صورت ضروری ہے۔

(الف) کسی دوسری سیاسی قوت سے اتحاد ”متحدہ دینی پلیٹ فارم“ کی طرف سے متفقہ طور پر ہو، تاکہ جس سیاسی قوت سے اتحاد کیا جائے وہ دینی جماعتوں کا پورا وزن، قوت، افادیت اور ناگزیریت محسوس کرے، اور اپنی

پالیسیوں میں ان کی دینی تعلیمات پر مبنی رائے کو فیصلہ کن وقت دینا اور دنیہ رہنا اس کی ضرورت بن جائے۔ اس طرح انشاء اللہ یہ متحدہ دینی پلیٹ فارم اس عبوری دور کے اتحاد کو بھی نہ صرف ملک کی گہنائی ہوئی آزادی کو بحال کرانے کے لئے استعمال کر سکے گا، بلکہ اسے نفاذ شریعت اور اسلامی معاشرے کی منزل مقصود کی طرف بھی کسی نہ کسی رفتار سے گامزن کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ایسا نہ ہو کہ ماضی کی طرح، پھر کچھ دینی جماعتیں ایک سیاسی قوت سے، اور کچھ دوسری قوت سے وابستگی اختیار کر لیں، اور کوئی جماعت یا جماعتیں پھر ”الگ الگ پرواز“ کا معنی خیز سیاسی مظاہرہ کرنے لگیں، جس کے آثار دکھائی دے رہے ہیں، خدا نخواستہ ایسا ہوا تو ممکن ہے چار چھ سیٹیں کچھ دینی جماعتوں کو پھر مل جائیں، اور وقتی طور پر کچھ شخصی، جماعتی، یا مسلکی مفادات بھی حاصل ہو جائیں، لیکن اس طرح ظاہر ہے کہ دینی قوت پھر بکھر کر بے اثر جائے گی، دینی مقاصد پھر پس منظر میں چلے جائیں گے، کوئی دینی جماعت ان ملکی و ملی مسائل کو حل کرانے کی پوزیشن میں نہ ہوگی جنہیں حل کرنا دینی سیاسی جماعتوں کا فرض منصبی ہے، نفاذ شریعت اور اسلامی معاشرے کا قیام بس ایک نعرہ ہی بنا رہ جائے گا، ”ملی یکجہتی کونسل“ کے قیام سے امید کی جو دھندلی سی کرن عوام کو نظر آئی ہے، وہ پھر حسرتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گم ہو جائے گی، دینی سیاسی جماعتوں پر عوام کا رہاسہا اعتماد بھی دم توڑ دے گا، اور اسلام دشمن طاقتوں کو پھر پہلے سے زیادہ بغلیں بجا بجا کر (نعوذ باللہ) اسلام کی شکست کا اعلان کر کے اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جائے گا۔

(ب) اس عبوری دور میں دوسری ناگزیر سیاسی قوتوں میں سے کس کے ساتھ اتحاد یا اشتراک عمل کیا جائے؟ اس کا فیصلہ ”أَهْوَنُ الْبَلَاءَيْنِ“ (دونوں گزیر

برائیوں میں سے کمتر برائی کو اختیار کرنے) کے شرعی قاعدہ کلیہ کی بنیاد پر ہونا چاہئے، یہ قاعدہ کلیہ قرآن و سنت سے ماخوذ اور اجماع امت سے ثابت شدہ ہے، اس میں کسی فقہی مسلک کا اختلاف نہیں، اس قاعدہ کلیہ کے خلاف کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ملک و ملت پر پھر ”اَشَدُّ الْبَلِيَّتَيْنِ“ (دونا گزیر برائیوں میں سے شدید تر برائی) کو مسلط کرنے کی۔ دانستہ یا نادانستہ۔ کوشش کی جائے جو باجماع امت حرام ہے۔

(ج) دوسری کسی سیاسی قوت سے اتحاد یا اشتراک عمل ایسی شرائط کے ساتھ مشروط ہونا چاہئے جن کے ذریعہ ملی و ملکی مقاصد کو ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ قریب لایا جاسکے، من جملہ دیگر شرائط کے یہ شرط رکھنا بھی ان مقاصد کے لئے مفید ہوگا، بلکہ ناگزیر ہے، کہ اس اتحاد کی طرف سے الیکشن میں امیدواری کا ٹکٹ صرف ان ہی افراد کو دیا جاسکے گا جن میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں دی گئی صفات اہلیت موجود ہوں۔ نیز ماضی قریب کے تلخ تجربے کو پیش نظر ایسی پیش بندیاں اختیار کی جانی چاہئیں کہ جس سیاسی قوت سے اتحاد کیا جائے اس کے لئے اقتدار میں آجانے کے بعد شرائط اتحاد سے انحراف کرنا آسان نہ ہو، مثلاً یہ کہ اتحاد کا معاہدہ تحریری ہو جسے پریس میں شائع کیا جائے، اور معاہدے کو ماہرین قانون کے مشورے سے حتی الامکان ایسا قانونی تحفظ فراہم کیا جائے کہ انحراف کی صورت میں عدالتی چارہ جوئی ممکن ہو، دینی مقاصد کے حصول کے لئے سیٹوں کی موثر تعداد اور بعض کلیدی نوعیت کی وزارتوں کی پیشگی شرط بھی احتیاط اور پیش بندی کے طور پر رکھی جاسکتی ہے، تاکہ دینی قوت شریک اقتدار ہو تو اسے تابع مہمل ہونے کے بجائے اپنے دینی منشور کو ممکن حد تک روبہ عمل لانے کا موقع مل سکے۔ اس بار امانت کو اٹھانے کے لئے ابھی سے ایسی باصلاحیت

اور باکردار شخصیات کو تلاش اور تیار کیا جائے جو جذبہ خدمت سے سرشار ہوں۔ ذاتی اور گروہی مفادات کے لئے تو ایسی شرط جائز نہیں، لیکن اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ناگزیر ہو تو شرعاً اس میں کوئی مضائقہ نہیں، دلوں کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔

۸۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا تو ہمیں سنجیدگی اور اخلاص و للہیت کے ساتھ اسی پر از سر نو غور و فکر اور باہمی مشورے کا اہتمام کر لینا چاہئے کہ انتخابی سیاست میں عملی طور پر داخل ہونے کے بعد سے اب تک ہر الیکشن میں ناکامی کا داغ جو اسلام کے نام پر لگتا آرہا ہے، کیا جگہ ہنسائی کے اس اذیت ناک سلسلہ کو یوں ہی جاری رکھا جانا ضروری ہے؟ خصوصاً جب کہ ناکامی کا گراف ہر مرتبہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی اونچا ہوتا جا رہا ہے؟

کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہماری تنظیمیں یا ان کی متحدہ ”ہیئت اجتماعیہ“ اپنی ساری توجہ افراد سازی، اصلاح معاشرہ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، عوام و خواص کی دینی تعلیم و تربیت، خدمت خلق، دیہات اور شہروں میں رفاہی اداروں کے قیام، اور ناظرہ قرآن کریم کی تعلیم کے ذریعہ ملک میں شرح خواندگی بڑھانے جیسی تعمیری کوششوں پر مرکوز کر دیں، اور انتخابی اکھاڑے میں مختلف فریقوں کے تابع مہمل بن کر، یا خود ایک کمزور اور مشکوک فریق بن کر اترنے کے بجائے ایک دیانت دار اور قابل اعتماد ثالث کے فرائض انجام دیں، اعلاء کلمۃ اللہ ہمارا نصب العین ہو، اور سیاست اور معاشرہ و معیشت میں پاسے جانے والے ہر منکر کے ازالے کے لئے سنت انبیاء کرام علیہم السلام کے مطابق حکمت و موعظت کے ساتھ جدوجہد ہمارا شعار ہو، ان مقاصد کے لئے ہمارا خیر خواہانہ اور بے لاگ خطاب حزب اقتدار اور حزب اختلاف سے بھی ہو اور عوام سے بھی۔ اس طرح ہم انتخابی سیاست میں فریق بننے کے بجائے، اچھے کردار والے

لوگوں کو ایوانہائے اقتدار میں بھیج کر وہ راستہ اختیار کریں جس سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے برصغیر کی سیاست میں پرامن حیرت ناک خوشگوار دینی انقلاب برپا کیا تھا۔

بہر کیف ایہ بھی ایک راستہ ہے جس کا باریک بینی سے محتاط تحقیقی جائزہ لیکر شاید ان مسائل کا حل تلاش کیا جاسکے جو امت مسلمہ کو عموماً اور پاکستان کو خصوصاً درپیش ہیں۔

آخر میں اس طول بیانی پر معذرت چاہتے ہوئے درخواست ہے کہ یہ معروضات محض ”الدین النصیحة“ کے جذبے سے سپرد قلم کی گئی ہیں، حاشا وکلا! کسی پر طنز یا کسی کی تضحیک دور دور پیش نظر نہیں، اگر خدا نخواستہ کہیں ایسا محسوس ہو تو عاجزانہ التجا ہے کہ ازراہ کرم اسے یہ یقین کرتے ہوئے معاف فرما دیا جائے کہ یہ کوتاہی زبان و بیان کی ہے قلب و نیت کی ہر گز نہیں۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ اَرِزُقْنَا اَتِّبَاعَهُ،

وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّ اَرِزُقْنَا اجْتِنَابَهُ.

وصل علی رسول خاتم النبیین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

ومن تبعہم باحسان الی یوم الدین، وسلم تسلیما کثیرا کثیرا.



نظام قضاء کی شرعی حیثیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظام قضا کی شرعی حیثیت

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے رکن ہیں، اسلامی نظریاتی کونسل نے ۲۲ جون ۱۹۹۸ء کو ضابطہ دیوانی کے جائزہ کے لئے ایک ذیلی کمیٹی بنائی، جس کا نام ”کمیٹی برائے جائزہ ضابطہ دیوانی“ تھا، حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم اس کمیٹی کے کنوینر تھے، کمیٹی نے حضرت مدظلہم کی سربراہی میں ضابطہ دیوانی کی اصلاحات سے متعلق بہت اہم اور مفصل سفارشات مرتب کیں، جن کو کونسل نے منظور کیا، یہ رپورٹ جو ۳۰۵ صفحات پر مشتمل ہے، کونسل نے سرکاری استعمال کیلئے بھی طبع کر دی ہے، اسکے شروع میں حضرت مدظلہم نے نظام عدالت سے متعلق ایک اہم مقدمہ تحریر فرمایا ہے، یہاں اس مقدمہ کا صرف وہ حصہ شامل اشاعت کیا جا رہا ہے جو نظام قضا کی شرعی اہمیت سے متعلق ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد:

عدل وانصاف فراہم کرنا ایک اسلامی ریاست کا بنیادی فریضہ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انبیاء کرام علیہم السلام کے فرائض میں شامل فرمایا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا:

﴿يَدَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ﴾ (سورہ ص، ۳۸: ۲۶)

ترجمہ :- (اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے، پس لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور نفسانی خواہشات کی پیروی مت کرنا،) یہی حکم دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کو دیا گیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَتُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ﴾ (المائدہ ۴۴: ۵۰)

ترجمہ :- (ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اس کے مطابق انبیاء فیصلہ کرتے تھے)

اور خاتم النبیین علیہ الصلاۃ والسلام کو تلقین فرمائی گئی کہ:

﴿فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ هُمْ﴾ (المائدہ، ۵: ۴۸)

ترجمہ :- (پس آپ ان (اہل کتاب) کے درمیان فیصلہ اس کتاب (قرآن) کے موافق کیا کیجئے جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے، اور ان کی (خلاف شرع) خواہشوں

پر عمل درآمد نہ کیجئے)

یہ خطاب بھی آنحضرت ﷺ سے ہے کہ:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ﴾

(سورۃ النساء، ۱۰۵:۳)

ترجمہ:- (بے شک ہم نے آپ کے پاس یہ سچی کتاب (قرآن) بھیجی، تاکہ آپ اللہ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔)

نظام عدل قائم کرنے کی اہمیت کا کچھ مزید اندازہ آنحضرت ﷺ کے مندرجہ ذیل ارشادات اور اس طرز عمل سے بھی ہوتا ہے جو آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں اختیار فرمایا:

(۱) آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

کیف یقدس اللہ امة لا یؤخذ لضعیفهم من شدیدهم (الحديث^(۱))

ترجمہ:- (اللہ تعالیٰ ایسی جماعت کو (گناہوں اور فتنوں) سے کیسے پاک کر سکتا ہے جس میں ضعیف کو طاقتور سے حق نہ دلایا جائے۔)

(۲) آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

سبعة یظلهم اللہ فی ظلہ یوم لا ظل الا ظلہ، الامام العادل الخ^(۲)

ترجمہ:- (وہ سات قسم کے لوگ جن کو (میدان حشر میں) اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں اس وقت جگہ دے گا، جب اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہیں ہوگا،

(۱) سنن ابن ماجہ کتاب الفتن، حدیث ۳۱۰، ۳۱۱

(۲) صحیح البخاری کتاب الاذان، حدیث ۶۶۰ صحیح مسلم کتاب الزکاة، حدیث ۲۳۸۰، موطأ امام مالک، باب ماجاء فی المتحابین فی اللہ حدیث، ۷۶۹، سنن الترمذی کتاب الزہد حدیث ۲۳۹۱ سنن النسائی کتاب، آداب القضاة، حدیث ۵۳۸۲

یہ ہیں: عدل و انصاف والا حاکم الخ)

عدل قائم کرنا حکومت کے بنیادی ارکان میں سے ہے، جس کے بغیر انسانوں کی نہ جانیں محفوظ رہ سکتی ہیں، نہ آبرو، نہ ان کے اموال اور حقوق، بلکہ تجربہ شہد ہے کہ حکومتیں اگرچہ کفر و شرک کے ساتھ بھی قائم رہ جاتی ہیں، لیکن ظلم کے ساتھ کوئی حکومت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتی، غرض یہ وہ بنیاد ہے جس پر معاشرے کا امن و امان اور سکون و اطمینان موقوف ہے، اسی لئے شریعت اسلامیہ نے قضا (عدالتی فیصلوں) کے لئے بھی اصول و قواعد ایسے مقرر کئے ہیں، جو اقوام عالم کے لئے قابل رشک اور قابل تقلید بنیں۔

عہد رسالت میں نظام عدل

نبی ﷺ لوگوں کے مابین خود بھی شریعت اسلامیہ کے مطابق فیصلے فرماتے تھے، اور متعدد صحابہ کرامؓ کو بھی مختلف شہروں میں قاضی مقرر فرمایا تھا، اور بعض صحابہ کرامؓ کو بیک وقت دو ذمہ داریاں سپرد فرمائیں، یعنی انتظام حکومت اور منصب قضاء، چنانچہ حضرت علی، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عقیل بن یسارؓ کو یمن کے مختلف علاقوں میں مقرر فرمایا، اور حضرت عتاب بن اسیدؓ کو مکہ مکرمہ کا امیر اور قاضی مقرر فرمایا، اور ساتھ ہی اس عظیم ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے ان کو خصوصی ہدایات بھی دیں^(۱)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بیان ہے:

بعثنی رسول اللہ ﷺ الی الیمن قاضیا، فقلت: یا رسول اللہ

ترسلنی وأنا حدیث السن ولا علم لی بالقضاء

(۱) ملاحظہ ہو قاضی القضاة امام شمس الدین السروی (۶۳۷-۷۱۰ھ) کی عظیم کتاب ادب القضاء پر مولانا شمس العارفین کا تحقیقی مقدمہ، ص ۹، طبع بیروت، دار البیضاء الاسلامیہ۔

فقال: الله سيهدى قلبك ويثبت لسانك، فاذا جلس بين يديك الخصمان فلا تقضين حتى تسمع من الآخر كما سمعت من الأول، فانه أحرى ان يتبين لك القضاء

قال: فما زلت قاضيا أو ماشككت في قضاء بعد^(۱)

ترجمہ۔۔ (مجھے رسول اللہ ﷺ نے قاضی بنا کر یمن بھیجا، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے بھیج رہے ہیں، حالانکہ میں کم عمر ہوں، اور مجھے قضاء کا علم بھی نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا: اللہ تیرے دل کی رہنمائی کرے گا، اور تیری زبان کو سیدھا رکھے گا، پس جب تیرے سامنے دو فریق حاضر ہوں، تو جب تک دوسرے کی بات اسی طرح نہ سن لو جس طرح پہلے کی بات سنی ہے، اس وقت تک ہرگز فیصلہ نہ کرنا، کیونکہ اس طرح تمہارے سامنے صحیح فیصلہ آسکے گا، حضرت علیؓ فرماتے ہیں: پس میں قاضی رہا (یہ فرمایا کہ) اس کے بعد کسی فیصلے میں مجھے شک نہیں ہوا۔)

خلافت راشدہ میں اور اس کے بعد

آنحضرت ﷺ کے بعد خلفاء راشدینؓ کا طریقہ بھی یہ رہا کہ وہ مقدمات کے فیصلے خود فرماتے تھے، اور دوسروں کو بھی قاضی مقرر کر کے اسلامی حکومت کے مختلف شہروں میں بھیجتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بار خلافت سنبھالا، تو حضرت عمر فاروق اعظمؓ کو مدینہ منورہ کا قاضی مقرر فرمایا^(۲)۔ اور حضرت انسؓ کو بحرین کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا^(۳)۔

(۱) سنن ابی داود کتاب الاقضية، حدیث ۳۵۸۲، بیہقی السنن الکبریٰ ج ۱۰، ص ۱۴۱

(۲) اخبار القضاة، ۱: ۱۰۴

(۳) سنن ابی داود کتاب الاقضية، حدیث ۳۵۸۲، بیہقی السنن الکبریٰ ج ۱۰، ص ۱۴۱

فاروق اعظم حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت ابو الدرداءؓ کو دمشق کا، شریح بن حارث الکندی کو کوفہ کا، اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بصرہ کا قاضی مقرر فرمایا، متعدد دوسرے حضرات کو اسلامی حکومت کے دور دراز علاقوں میں مقرر کیا، اور ان کو برابر وقتاً فوقتاً ہدایات بھیجتے رہے، ان ہدایات و خطوط میں فاروق اعظمؓ کا وہ مشہور خط خصوصی اہمیت کا حامل ہے جو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے پاس بھیجا تھا اور امام محمد بن الحسنؒ نے اس کا نام کتاب سیاست القضاء وتدبیر المحکم بیان کیا ہے^(۱)۔

اس اہم دستاویز کا مفصل عربی متن مفصل حوالوں اور اردو ترجمہ کے ساتھ ادارہ تحقیقات اسلامی (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی) کی شائع کردہ کتاب ادب القاضی میں دیکھا جاسکتا ہے، جہاں اس کی ضروری تشریح بھی بیان کی گئی ہے اور فاروق اعظمؓ کے دیگر خطوط جو انہوں نے اپنے مقرر کردہ قاضیوں کو تحریر فرمائے تھے وہ بھی ساتھ نقل کئے گئے ہیں^(۲)۔

عہد عثمانی^(۳) میں فتوحات کے دائرہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ قضاء کی وسعت بھی عمل میں آئی۔ حضرت عثمان غنیؓ خود بھی فیصلے فرماتے تھے، لیکن آپ کا طریقہ کاریہ ہوتا تھا کہ جب فریقین آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ وہ ایک فریق کو کہتے کہ جاؤ حضرت علیؓ کو بلا لاؤ۔ دوسرے کو حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کو بلائے کو بھیجتے۔

(۱) اخبار القضاة، ۱: ۱۰۴

(۲) ملاحظہ ہو کتاب ادب القاضی، ص ۳۳۵ تا ۳۸۶ شائع کردہ ادارہ تحقیقات اسلامی،

اسلام آباد، پاکستان۔

(۳) الاصابہ، ۱: ۸۵

جب سب آجاتے تو فریقین کو اپنی اپنی بات کہنے کا حکم فرماتے۔ پھر فریقین کی بات سن کر ان حضرات صحابہ کی رائے طلب فرماتے۔ اگر ان کی رائے سے حضرت عثمان غنیؓ کو اتفاق ہوتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔ ورنہ پھر بعد کو اس پر غور فرماتے۔ (اخبار القضاۃ، ج ۱، ص ۱۱۰).....

حضرت عثمان غنیؓ کے کارناموں کے ذیل میں طبری نے لکھا ہے کہ عہد عثمانی میں حضرت زید بن ثابتؓ بھی منصب قضاء پر فائز تھے۔

باب قضاء میں علیؓ "علی" تھے، سراج نبوت سے ہر صحابی نے کسب نور کیا، سب کے الگ الگ رنگ ہیں، علی مرتضیٰ کو اللہ نے کار قضاء میں ممتاز بنایا اور اقصاہم علی کا امتیاز انہیں ملا: کتنی گتھیوں کو ان کی ذہانت نے سلجھایا۔ ان کے عہد میں بھی مختلف قضاۃ فیصلے کرتے رہے، خود امیر المؤمنین علیؓ کا حضرت شریح کی عدالت میں حاضر ہو کر ایک یہودی کے خلاف انصاف چاہنا اور قاضی شریح کا امیر المؤمنین کے خلاف ایک یہودی کے حق میں فیصلہ دینا معروف ہے۔ حضرت علیؓ کے بعض فیصلوں کا ذکر و کج نے اخبار القضاۃ میں کیا ہے۔ (ص ۹۱)۔

عہد امویؓ (۲) کے معروف قاضیوں میں سیدنا حضرت ابوہریرہؓ کو بھی شمار کیا جانا چاہئے۔ عرصے تک مدینہ کے قاضی رہے۔ ان کا ایک مشہور فیصلہ ہے کہ ایک مقروض شخص کے بارے میں قرض دینے والے نے یہ درخواست کی کہ اسے جیل بھیج دیا جائے، سیدنا ابوہریرہؓ نے یہ درخواست رد کر دی اور فرمایا:

(۱) السرخسی المبیوط، ۶: ۱۶۰

(۲) یہاں سے عہد اموی کے قاضیوں کے تذکرے کے ختم تک کا مضمون مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب (قاضی ریاست دار القضاء مرکزی امارت شریعہ۔ بہار (اڑیسہ، بھارت) کی عظیم القدر کتاب اسلامی عدالت سے مأخوذ ہے۔

لا احبہ لك ولكن ادعه يطلب لك ولنفسه ولعیالہ^(۱)
(میں اسے تمہارے ادھار کی خاطر قید نہیں کروں گا، بلکہ چھوڑ رہا ہوں تاکہ وہ روزی کمائے تمہارا قرض ادا کرنے کے لئے، اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے)۔

عہد اموی میں ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوفؓ، طلحہ بن عبد الرحمن بن عوفؓ، نوفل بن مساحق العامریؓ، ابان بن عثمانؓ وغیرہ جلیل القدر علماء مدینہ کے قاضی مقرر ہوتے رہے، حضرت ابان بن عثمانؓ کے سانسے وہ مقدمات پیش ہوئے جن کا فیصلہ سیدنا عبد اللہ بن زبیرؓ کر چکے تھے، ابان بن عثمانؓ نے خلیفہ عبد الملک کو لکھ کر پوچھا کہ عبد اللہ بن زبیرؓ کے فیصلوں کے ساتھ کیا عمل کیا جائے؟ عبد الملک نے جواب دیا:

انا والله ما عينا على ابن زبير اقصيته ولكن عينا عليه ما تناول من الامر فاذا اتاك كتابي هذا فانفذ اقصيته، فان ترداد الاقضية متعسر^(۲)

(ترجمہ: ہم ابن زبیر کے فیصلوں پر تنقید نہیں کرتے، ہمیں ان کے سیاسی عمل سے اختلاف تھا، میرا یہ خط پہنچتے ہی ان کے فیصلوں کو نافذ کر دو، سابق فیصلوں کو رد کرنا دشواریوں کا موجب ہو گا)۔

اوپر جو آیات و احادیث بیان کی گئی ہیں اور خلفائے راشدین اور بعد کے خلفائے اسلام کے جس طرز عمل کی طرف کچھ اشارے کئے گئے، وہ یہ سمجھنے کے

(۱) اخبار القضاۃ، ۱: ۱۱۲

(۲) اخبار القضاۃ، ۱: ۱۱۳

لئے کافی ہیں کہ نظام عدل کا قیام ایک اسلامی حکومت کی کس قدر بھاری اور بنیادی ذمہ داری ہے۔

دیوانی مقدمات کی خصوصی اہمیت

خاص طور سے دیوانی مقدمات کی اہمیت اور نزاکت اس لحاظ سے اور زیادہ ہے کہ ان کا تعلق تمام حقوق العباد سے ہے، جن کے بارے میں شریعت کا قانون یہ ہے کہ وہ تو بہ سے بھی اس وقت تک معاف نہیں ہوتے، جب تک حق دار ہی اپنے حق کو معاف نہ کر دے، یا اس کا حق اسے نہ دے دیا جائے۔

پاکستان میں دیوانی مقدمات کی افسوس ناک صورت حال

لیکن افسوس ناک، بلکہ انتہائی تشویشناک، صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں دیوانی مقدمات کی کاروائی اتنی پیچیدہ، مشکل، مہنگی، اور سست ہوتی ہے کہ مقدمات کے فیصلہ ہونے میں تاخیر در تاخیر کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جاتا ہے اور مقدمات پر عائد ہونے والے مصارف اتنے بھاری ہوتے ہیں کہ وہ فریقین کے لئے خود ایک کڑی سزا سے کم نہیں ہوتے، فریقین کے عمریں بیت جاتی ہیں اور فیصلہ ان کے بیٹوں یا پوتوں کو بھی بمشکل ہی ملتا ہے، پھر ڈگری ملنے کے بعد بھی ڈگری دار کو حق یا تو ملتا ہی نہیں، یا اتنی ہی صعوبتوں، اور مصارف اور مدتوں کے بعد ملتا ہے، جتنی اصل مقدمے میں برداشت کی تھیں، بہ قول حمود الرحمن لاء کمیشن ڈگری لینا (پھر بھی نسبتاً) آسان اور تعمیل ڈگری مشکل ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مظلوموں کے بہت بڑی تعداد عدالت کا رخ کرنے سے ہی ڈرتی ہے اور عدالتی چکر سے بچنے کے لئے اپنے اوپر کئے جانے والے مظالم ہی کو

طوعاً و کرہاً برداشت کرنے میں عافیت سمجھتی ہے۔

پاکستان کے موجودہ ضابطہ دیوانی کی خامیاں

اس شرمناک صورت حال کا ایک سبب جہاں ہمارے ملک میں پھیلی ہوئی کرپشن ہے، جس نے سرکاری اداروں اور عدالتوں کے دفتری نظام کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، وہیں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری عدالتوں میں جو ضابطہ دیوانی (The code of civil procedure, 1908) انگریزی دور سے رائج چلا آ رہا ہے، اس میں:

(۱) جگہ جگہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے انحراف ہے (جس کی کچھ مزید تفصیل اس مقدمے کے آخر میں آئے گی)۔

(۲) بعض ایسی دفعات بھی موجود ہیں، جن میں بعض طبقات کے ساتھ امتیاز برتا گیا ہے، جو اسلامی عدل و انصاف کے منافی اور دستور پاکستان کے آرٹیکل ۵ کی خلاف ورزی ہے۔

(۳) حالات و زمانہ کی تبدیلی کے باعث بھی اب اس کی بہت سی دفعات فرسودہ ہو چکی ہیں، جو مقدمات کی کاروائی میں بلاوجہ پیچیدگی، رکاوٹوں یا نا انصافیوں کا باعث بنتی ہیں۔

(۴) اس میں متعدد دفعات اور رولز (rules) ایسے ہیں، جن کے باعث کسی معقول وجہ کے بغیر بھی مقدمات کی کاروائی چلتے چلتے سست روی یا تعطل کا شکار ہو جاتی ہے، یا انصاف کو مشکل بنادیتی ہے۔

(۵) پھر دیوانی مقدمات سے متعلق سارے ضابطے اسی ایک مجموعے میں موجود نہیں، بلکہ اس سلسلے کے وقتاً فوقتاً متفرق مزید ضابطے یا قوانین، نافذ کئے

جاتے رہے ہیں، اور وہ الگ الگ کتابچوں کی شکل میں شائع کئے گئے ہیں، جن کی طویل فہرست میں سے منسوخ شدہ ضابطوں اور قوانین کو نکال کر مندرجہ ذیل قوانین اب بھی رائج ہیں:

1. Law reforms Ordinance, 1970
2. Supreme Court rules, 1980
3. High Court rules and Orders.
4. Sind Chief Court rules (Original sind)
5. sind civil court rules, 1955.
6. Baluchistan civil Litigation (Shariah Application) Regulation, 197
7. FATA Laws.
8. provincial Small Causes Courts Act, 1987.
9. The Banking Companies Recovery of Loans, Advances, Credits and Finance Act, 1997.

سب کتابچوں کا کسی ایک جگہ سے دستیاب ہونا بھی بسا اوقات آسان نہیں ہوتا، قوانین کی کثرت، پھر ان کا ایک ہونا، اور قومی زبان میں نہ ہونا بھی پیچیدگی اور مشکلات کا باعث بنا ہے۔

تدوین جدید کی ضرورت

لہذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ دیوانی مقدمات کے لئے قرآن و سنت کی روشنی میں از سر نو ایک ایسا جامع، مختصر، سادہ آسان مجموعہ ترتیب دیا

جائے، جس میں اسلامی حکومتوں کے مختلف ادوار میں رائج شدہ طریق ہائے قضاء سے بھی استفادہ کیا گیا ہو، اور موجودہ دور کے ان ممالک کے ضابطہ ہائے دیوانی سے بھی مدد لی گئی ہو، جن میں دیوانی مقدمات زیادہ تیز رفتاری اور آسان سے کم خرچ میں فیصل ہو جاتے ہیں، مثلاً سعودی عرب وغیرہ۔

نیز ترتیب و تدوین کے وقت مغربی ممالک کے ضابطہ ہائے دیوانی کو بھی سامنے رکھا جائے اور خدما صفا و رعنا کدر (اچھی بات سنے لو، اور بری بات چھوڑ دو) کے اصول پر عمل کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ کے ارشاد الحکمۃ ضالۃ المؤمن (حکمت و دانشمندی کی بات مؤمن کی متاعِ گم گشتہ ہے) کا حاصل بھی یہی ہے۔



مشورہ کی دینی اہمیت

حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی تالیف ”یہ تیرے پر اسرار بندے“ جو جہاد افغانستان کی داستان ہے، اسکے آخر میں حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے مشورہ کی شرعی حیثیت و اہمیت سے متعلق ایک اہم مضمون تحریر فرمایا ہے، جو فقہی لحاظ سے بہت اہم اور مفید مسائل پر مشتمل ہے، اسکی فقہی اہمیت کے پیش نظر اسکو ”نوادر الفقہ“ کا بھی جزو بنایا جا رہا ہے۔

مشورہ کی دینی اہمیت

باہمی مشورہ خوشگوار تعلقات اور اتحاد کی جان ہے، اس کے بغیر کوئی اتحاد قائم ہوتا ہے، نہ باقی رہ سکتا ہے، اہم معاملات میں صلاح و مشورے سے باہمی اعتماد و یگانگت بڑھتی، اور دلوں کی صفائی ہوتی رہتی ہے، جبکہ خود رائی کا زہر قاتل مضبوط سے مضبوط اتحاد کو موت کے گھاٹ اتار کر ہی دم لیتا ہے، اس انسانی فطرت کو بدلا نہیں جاسکتا کہ خود رائی سے کام لینا اور ساتھیوں کو اعتماد میں لئے بغیر بڑے بڑے فیصلے کرنے والے کے مخلص ترین ساتھی بھی زیادہ عرصے تک اس کا ساتھ نہیں دے پاتے۔

اور تو اور صحابہ کرامؓ جن سے بڑھ کر اطاعت شعاری اور جاں نثاری کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا ان کے بارے میں بھی آنحضرت ﷺ کو یہ تلقین فرمائی گئی کہ (۱)

(۱) مشورے سے متعلق آنیوالی جملہ اسلامی تعلیمات، تفسیر "معارف القرآن" سے اختصار کے ساتھ ماخوذ ہیں، پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اس تفسیر کی جلد ۲ ص ۲۱۳ تا ۲۲۷ اور جلد ۷ ص ۷۰۲ تا ۷۰۷۔ البتہ احادیث کے عربی متن اور مفصل حوالوں کا، نیز "مغربی جمہوریت" کے عنوان سے کچھ تاریخی تفصیل کا اضافہ ناچیز نے کیا ہے۔ ر فیج

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ، وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ، فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ، فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾

تو اللہ ہی کی رحمت کے سبب آپ (ﷺ) ان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہ) کے ساتھ نرم رہے، اور اگر آپ (ﷺ) تند خو سخت مزاج ہوتے تو یہ آپ (ﷺ) کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے، پس آپ ان کو معاف کر دیجئے، اور ان کیلئے استغفار کیجئے اور ان سے خاص خاص (اہم) باتوں میں (بدستور) مشورہ لیتے رہا کیجئے، پھر جب آپ (ﷺ) کسی ایک جانب (راستے) پختہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ (کر کے) اس کام کو کر ڈالا کریں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسا بھروسہ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ (سورہ آل عمران-۱۵۹)

یہ آیت غزوہ احد کے بعد نازل ہوئی ہے، اس جہاد میں بعض مسلمانوں کی لغزش اور غلط افواہ کی بناء پر میدان چھوڑنے سے جو صدمہ اور غم آنحضرت ﷺ کو پہنچا تھا، اگرچہ آپ نے طبعی اخلاق اور عفو و کرم کی بنا پر ان کو اس پر کوئی ملامت نہیں کی، اور کوئی معاملہ سختی کا بھی نہیں فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کے ساتھیوں سے دلجوئی اور خود ان کے دلوں میں اپنی اس غلطی پر جو صدمہ اور ندامت تھی اس کو دھو دینا منظور ہوا، چنانچہ پیچھے اسی صورت کی آیت (۱۵۵) میں ان کی معافی کا اعلان فرمادیا گیا، اور اس آیت (۱۵۹) میں آنحضرت ﷺ کو ان کے ساتھ مزید لطف و کرم کا، اور ان سے اہم معاملات میں حسب سابق مشورہ لیتے رہنے کا حکم دیا گیا۔

یہاں ایک خاص بات توجہ طلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جو اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین رسول اور صاحب وحی ہیں، بہ ظاہر انہیں کسی مشورے کی ضرورت

نہ تھی، آپ کو ہر بات حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ کو ساتھیوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے، تو کوئی اور شخص خواہ وہ کتنا ہی دانشمند، تجربہ کار، باصلاحیت اور اپنے ساتھیوں میں مقبول ہو، باہمی صلاح مشورے سے کیسے بے نیاز ہو سکتا ہے؟

اسلام میں مشورے کی اہمیت کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم کی ایک بڑی سورت کا نام ہی الشوریٰ (مشورہ) ہے، اس سورت میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ:

وامرهم شوریٰ بینہم

اور ان کا ہر اہم کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔ (الشوریٰ-۳۸)

حتیٰ کہ ماں باپ میں سے کوئی اگر بچے کا دودھ مدت رضاعت سے پہلے چھڑانا چاہے، تو قرآن کریم نے انہیں بھی ہدایت فرمائی کہ یہ کام دونوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہئے^(۱)۔

باہمی صلاح مشورے کا چونکہ تنظیمی اجتماعی اور جہادی مہمات سے بھی بہت گہرا تعلق ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند امور کی وضاحت قرآن و سنت کی روشنی میں ہو جائے۔

(۱) مشورہ کن امور میں ہونا چاہئے؟

اوپر کی دونوں آیتوں میں لفظ امر مذکور ہے، یعنی دونوں آیتوں میں اصولی

(۱) دیکھئے سورہ البقرہ-آیت ۲۳۳

طور پر یہ بتلایا گیا ہے کہ مشورہ امر کے بارے میں ہونا چاہئے۔ لفظ امر عربی زبان میں کئی معنی کیلئے آتا ہے، ہر مہتمم بالشان قول و فعل کو بھی کہا جاتا ہے، اور حکم اور حکومت کو بھی۔ لفظ امر کے خواہ پہلے معنی مراد لئے جائیں یا دوسرے، حکومت کے معاملات میں مشورہ لینا، بہر صورت ان آیات سے ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر پہلے ہی معنی مراد لیں تب بھی حکم اور حکومت کے معاملات مہتمم بالشان ہونے کی حیثیت سے قابل مشورہ ٹھہریں گے، اس لئے امر کے معنی ان آیات میں ہر اس کام کے ہیں جو خاص اہمیت رکھتا ہو، خواہ حکومت سے متعلق ہو یا دیگر معاملات سے۔

البتہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مشورہ صرف انہی چیزوں میں سنت یا واجب ہے جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں کوئی واضح قطعی حکم موجود نہ ہو، ورنہ جہاں کوئی قطعی اور واضح شرعی حکم موجود ہو اس میں کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں مثلاً کوئی اس میں مشورہ کرے کہ نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج جیسے فرائض ادا کرے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ مشورے کی چیزیں نہیں، شرعی طور پر قطعی فرض ہیں، البتہ اس میں مشورہ کیا جاسکتا ہے کہ مثلاً حج کو پانی کے جہاز سے جائیں یا ہوائی جہاز سے؟ زکوٰۃ کن مستحقین کو کتنی کتنی دی جائے؟ وغیرہ کیونکہ ان امور میں قرآن و سنت نے کوئی خاص طریقہ متعین نہیں کیا بلکہ بندوں کو اختیار دیا ہے کہ حالات کے پیش نظر جس صورت کو مناسب سمجھیں اختیار کر لیں، ایک حدیث میں اس کی تشریح خود رسول اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ حضرت علیؓ نے پوچھا یا رسول اللہ اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا کوئی واضح حکم یا ممانعت (قرآن و سنت میں) موجود نہ ہو تو میرے لئے آپ کا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا:

”شاوَر وافیه الفقہاء والعابدین ولا تمضوا فیہ رأی خاصۃ^(۱)“

اس میں ایسے لوگوں سے مشورہ کرو جو فقہاء اور عبادت گذار ہوں، اور اس میں کسی کی تمہارے کو نافذ نہ کرو۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مشورہ صرف انتظامی اور سیاسی یا نجی معاملات ہی میں نہیں بلکہ جن شرعی مسائل میں قرآن و سنت کے صریح احکام نہ ہوں ان مسائل میں بھی مشورہ مسنون ہے۔

(۲) ارکان شوریٰ میں دو وصف ضروری ہیں

اسی حدیث سے یہ اصول بھی سامنے آیا کہ جن لوگوں سے مشورہ لیا جائے ان میں دو وصف ہونے ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہ موجودہ لوگوں میں عبادت گذاری (دیانت داری) میں معروف ہوں، دوسرے یہ کہ جو معاملہ زیر مشورہ ہے اس میں اچھی بصیرت اور تجربہ رکھتے ہوں۔ مذکورہ بالا حدیث میں حضرت علیؓ کا سوال چونکہ صرف شرعی مسائل (کسی چیز کے شرعاً جائز، واجب یا ناجائز ہونے) کے بارے میں تھا، اس لئے آنحضرت ﷺ نے فقہاء یعنی ایسے علماء دین سے مشورہ لینے کی ہدایت فرمائی، جو فقہ میں گہری بصیرت رکھتے ہوں، جس کا تقاضا یہ ہے، کہ زیر غور معاملہ اگر فقہی مسئلہ نہیں، بلکہ کسی اور علم و فن سے متعلق ہو، تو وہاں مشورہ اس میدان کے دیانت دار علماء یا ماہرین سے لینا چاہئے البتہ عبادت گذاری اور دیانت داری کا وصف، جس کا حاصل تقویٰ ہے دونوں قسم کے مشیروں میں ضروری ہیں، چنانچہ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ

(۱) رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ موثقون من اہل الصحیح، وکذا فی مجمع الزوائد للہیثمی

باب فی الاجماع ص ۱۷۸ ج ۱- وکنز العمال ص ۴۱۱ ج ۳ حدیث ۷۱۹۱

سے ایک اور حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”المستشار مومن“^(۱)

جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے

یعنی مشورہ اس کے پاس ایک امانت ہے، اس پر لازم ہے کہ اس معاملے میں جو کام وہ خود اپنے لئے پسند کرتا اسی کی رائے دوسرے کو بھی دے، اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔

(۳) مشورہ کی شرعی حیثیت

مذکورہ بالا قرآن حکیم کے ارشادات اور احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایسے اہم معاملے میں جس میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں، مشورہ لینا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی سنت اور دنیا و آخرت میں باعث برکات ہے، اور جن معاملات کا تعلق عوام سے ہے، جیسے معاملات حکومت ان میں دیانت دار اہل بصیرت (اہل حل و عقد) سے مشورہ لینا واجب ہے۔ (تیسرا بن بصر)

قرآن کریم کی آیات مذکورہ اور رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کا مسلسل عمل اس کی روشن سند ہے۔

غرض شورا ایت اور مشورے کو اسلامی حکومت کیلئے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے، حتیٰ کہ اگر امیر (حاکم) مشورے سے آزاد ہو جائے، یا ایسے لوگوں کے مشوروں پر انحصار کرنے لگے جو شرعی نقطہ نظر سے مشورے کے اہل

(۱) رواہ الطبرانی عن عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ ورجالہ رجال ”الصحيح“ ورواہ

البارکذا فی مجمع الزوائد ص ۹۷ ج ۶ اما حدیث علی رضی اللہ عنہ فانظر لہ فی مجمع

الزوائد ص ۹۶ ج ۸

نہیں تو اسے (قانونی اور پر امن طریقے سے) معزول کر دینا واجب ہے۔ (تفسیر النہج الحید)

باہمی صلاح مشورے کے شرعی حکم پر عمل کرنے سے جو فوائد و ثمرات اور برکات اسلامی قوتوں، اور پورے معاشرے اور افراد کو حاصل ہوتے ہیں، ان کا کچھ اندازہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے لگائے کہ:

”من اراد امر افشا و فیہ وقضی اللہ ھدی لا رشد الامور“
جو شخص کسی اہم کام کا ارادہ کرے، اور باہم مشورے کے بعد اخلاص کے ساتھ فیصلہ کرے، تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) اس کو بہترین فیصلے کی ہدایت مل جاتی ہے۔ (شعب الایمان للہیثمی - ۷۵۳۸)

نیز آپ کا ارشاد ہے کہ:

”اذا کان امرؤکم خیارکم، واغنیائکم سمحاء کم
وامورکم شورعی بینکم فظہر الارض خیر لکم من بطنھا
واذا کان امرؤکم شرارکم، واغنیائکم بخلاء کم،
وامورکم البی نساء کم فبطن الارض خیر لکم من ظھوھا“
”جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین افراد ہوں، اور تمہارے مالدار سخی ہوں، اور تمہارے اہم معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہوں تو زمین کی پشت (پر زندہ رہنا) تمہارے لئے اس کے پیٹ (قبر) سے بہتر ہے، اور جب تمہارے حکام تم میں سے بدترین افراد ہوں، اور تمہارے مالدار بخیل ہوں، اور تمہارے اہم معاملات عورتوں کے سپرد ہو جائیں، تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پشت سے بہتر ہے۔“

(جامع الترمذی - حدیث ۲۲۶۶)

مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے اہم معاملات (جن میں حکومت کے

معاملات بھی داخل ہیں) عورتوں کے اختیار میں دیدو تو اس وقت کی زندگی سے تمہارے لئے موت بہتر ہے۔ ورنہ جہاں مشورے کا تعلق ہے تو وہ کسی خاتون سے لینا بھی کوئی ممنوع نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہے جس کی بہت سی مثالیں سیرت طیبہ اور صحابہ کرام کی سیرتوں میں موجود ہیں، اور پیچھے سورہ بقرہ کی آیت (۲۳۳) کے حوالے سے آچکا ہے کہ بچے کا دودھ مدت رضاعت میں چھڑانا باپ اور ماں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیئے اس میں چونکہ معاملہ عورت سے متعلق ہے اس لئے قرآن حکیم نے وہاں تو خاص طور پر عورت کے مشورے کا پابند کیا ہے۔

(۴) آنحضرت ﷺ کو مشورہ لینے کا حکم کیوں دیا گیا؟

اس کی وجہ بعض علماء کرام نے یہ بیان کی ہے کہ چونکہ آنحضرت ﷺ کو ہر بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہو سکتی تھی اس لئے آپ کو نہ مشورے کی ضرورت تھی نہ اس پر آپ کے کسی کام کا مدار تھا، صرف صحابہ کرام کے اعزاز اور دلجوئی کیلئے آپ کو ان سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا۔

لیکن امام ابو بکر بھصاؓ نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کی مجالس مشورہ کی تاریخ بھی یہی بتلاتی ہے، کہ آنحضرت ﷺ کو عام امور میں تو براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ایک طریق کار متعین کر دیا جاتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت و رحمت سے بعض معاملات کو آپ کو رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا تھا، ایسے ہی معاملات میں مشورے کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ کو اسی قسم کے امور میں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔

غزوہ بدر، غزوہ احزاب، صلح حدیبیہ، اور قصہ اٹک وغیرہ کے موقع پر آپ

کے صحابہ کرام سے مشورہ لینے کے واقعات سیرت طیبہ اور کتب حدیث میں موجود ہیں، بہت مرتبہ آپ نے اپنی رائے چھوڑ کر بھی صحابہ کرام کے مشورے کو قبول فرمایا، اور ان کی رائے پر فیصلہ فرمایا دیا، یہ سب معاملات وہ تھے جن میں آنحضرت ﷺ کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص جانب متعین نہیں کی گئی تھی، ورنہ اس کے خلاف آپ ہرگز کسی کی رائے قبول نہ فرماتے، اور ایسا کرنے میں حکمت و مصلحت یہ بھی تھی کہ آئندہ امت کیلئے مشورے کی سنت آپ کے عمل سے جاری ہو جائے کہ جب آپ بھی مشورے سے بے نیاز نہیں تو پھر کون ایسا ہے جو بے نیازی کا دعویٰ کر سکے، چنانچہ اب یہ آیت جس میں آپ کو مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ:

”اما ان الله ورسوله غيان عنها، ولكن جعلها الله رحمة لامتي، فمن شاور منهم لم يعدم رشداً ومن ترك المشورة منهم لم يعدم عناء“

اللہ اور اس کے رسول کو مشورے کی حاجت نہیں، لیکن اللہ نے اس کو میری امت کیلئے ایک رحمت بنایا ہے، پس ان میں سے جو شخص مشورہ کرے گا وہ (بہتر کام کی) ہدایت سے محروم نہ رہے گا، اور جو شخص مشورہ لینا چھوڑ دے گا وہ مشقت سے بچا نہیں رہے گا۔

(شعب الایمان للبیہقی..... حدیث ۷۵۳۲)

(۵) اسلام کا طرز حکومت شورائی ہے

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے اسلام کے طرز حکومت اور آئین کے کچھ بنیادی اصول بھی سامنے آگئے کہ اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے، جس میں امیر و سربراہ کا انتخاب مشورے سے ہوتا ہے خاندانی وراثت نہیں۔

آج تو اسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دنیا میں اس اصول کا لوہا مانا جا چکا ہے، لیکن اب سے ۱۴ سو برس پہلے کی دنیا کی طرف مڑ کر دیکھئے، جب پوری دنیا پر ”دو بڑوں“ قیصر و کسریٰ کی حکومت تھی، یہ دونوں حکومتیں شخصی اور وراثتی بادشاہت ہونے میں شریک تھیں، جس میں شخص واحد لاکھوں کروڑوں انسانوں پر اپنی قابلیت و صلاحیت سے نہیں، بلکہ وراثت کے ظالمانہ اصول کی بنا پر حکمرانی کرتا تھا، اور انسانوں کو پالتو جانوروں کا درجہ دینا بھی شاہی انعام سمجھا جاتا تھا، یہی نظریہ حکومت دنیا کے بیشتر حصے برسلط تھا، صرف یونان میں جمہوریت کے چند دھندلے اور ناقص نقوش پائے جاتے تھے، لیکن وہ بھی اتنے ناقص اور مدہم تھے کہ ان اصولوں پر کبھی کوئی مستحکم حکومت نہ بن سکی، بلکہ وہ ارسطو کے فلسفے کی ایک شاخ بن کر رہ گئے۔

اس کے برخلاف اسلام نے حکومت و ریاست میں وراثت کا غیر فطری اصول باطل کر کے سربراہ حکومت و ریاست کو مقرر اور معزول کرنا جمہور (عوام) کے اختیار میں دیدیا جس کو وہ اپنے نمائندوں (اہل حل و عقد) کے ذریعہ استعمال کر سکیں، بادشاہ پرستی کی دلدل میں پھنسی ہوئے دنیا اسلامی تعلیمات ہی کے ذریعہ اس عادلانہ فطری نظام سے آشنا ہوئی، اور یہی روح ہے اس طرز حکومت کی جس کی بگڑی ہوئے شکل کو آج ”جمہوریت“ کا نام دیا جاتا ہے۔

مغربی جمہوریت

لیکن موجودہ طرز کی جمہوریتیں ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس کی پیروی میں قائم ہوئیں، یہ انقلاب بلاشبہ مطلق العنان بادشاہت پر ایک فیصلہ کن ضرب لگاتا ہوا نمودار ہوا، اور اٹھارویں اور انیسویں صدی کے زمانے میں یورپ کے اکثر

ممالک میں جمہوری حکومتی قائم ہوتی چلی گئیں۔

مگر خود یہ انقلاب لادینیت (سیکولرزم) کی آغوش میں پروان چڑھا تھا، اور نظام سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کے کندھوں پر سوار ہو کر بادشاہتوں کے جبر و استبداد اور ظلم و ستم کے رد عمل کے طور پر رونما ہوا، اس لئے مغربی جمہوریتیں بھی اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی کے ساتھ آئیں کہ عوام کو، بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ عوام کے نام پر سرمایہ داروں، جاگیر داروں اور زور آور طبقوں کو..... مطلق العنان بنا کر پورے آئین حکومت اور قانون کا ایسا آزاد مالک بنادیا کہ وہ زمین و آسمان اور تمام انسانوں کو پیدا کرنے والے خدا سے اور اس تصور سے بھی بیگانہ ہو گئے کہ اصل حاکم اور مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے، اب ان کی جمہوریت اللہ تعالیٰ ہی کے بخشے ہوئے عوامی اختیار پر اللہ تعالیٰ ہی کی عائد کی ہوئی پابندیوں کو بھی بار خاطر اور خلاف تصور کرنے لگی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ بے لگام سیاسی اقتدار ہاتھ میں آجانے کے بعد ان زور آور طبقوں پر کوئی قانونی یا اخلاقی پابندی بھی باقی نہ رہی انہوں نے پورے ملکی قانون ہی کو اپنے ذاتی مفادات کے سانچے میں ڈھال لیا، رہے غریب اور بے سہارا عوام تو یہ جمہوریتیں جو ان ہی کے نام پر وجود میں آئی تھیں، ان کے دکھوں کا مداوا بننے کے بجائے زور آور طبقوں اور ان کے خود غرضانہ مفادات کی تابع مہمل بن کر رہ گئیں، غریب عوام کا خون پہلے بادشاہتیں نچوڑ رہی تھیں تو اب پر فریب سرمایہ دارانہ نظام کا خون سودی بنکاری اور طرح طرح کی معاشی شعبہ بازیوں سے کشید کرنے لگا کوئی اس نظام کا ذرا گہری نظر سے جائز لے تو بے اختیار پکارا اٹھے گا کہ

خنجر یہ کوئی داغ، نہ دامن پر کوئی چھینٹ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

جو نظام سرمایہ داری ان مغربی جمہوریتوں کے ذریعہ تکمیل کو پہنچا، اسی کی چیرہ دستیوں کے رد عمل میں کمیونزم کا وہ عفریت نمودار ہوا جس کے سامنے چنگیز اور ہلاکو خان کی درندگی بھی ماند پڑ گئی، اور عوام پہلے سے زیادہ مظلوم و مقہور ہو کر کمیونزم کا ایک بے جان پرزہ بن کر رہ گئے..... یہ نظریہ لادینیت (سیکولرزم) ہی تھا جس کی ایک کوکھ سے ظالمانہ نظام سرمایہ داری نے جنم لیا تو دوسری کوکھ سے سفاک کمیونزم برآمد ہوا اور دونوں نے دنیا کے غریب و بے بس عوام کا خون بچوڑنے میں کوئی دقیقہ فراموش نہیں کیا۔

غرض سیکولرزم (لادینیت) ایسی دلدل ثابت ہوئی جس میں بہنس کر دنیا کا بڑا حصہ بادشاہت کے تنخے سے نکلا تو نظام سرمایہ داری کے جال میں جا پھنسا، اس سے نکلنے کی کوشش کی تو کمیونزم کے شکنجے میں کسا گیا..... شاعر مشرق نے یہ کہہ کر محض شاعری نہیں کی تھی کہ:

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلامی آئین نے جس طرح خلق خدا کو بادشاہتوں کے جبر و استبداد کے پینچے سے نجات دلائی اسی طرح جمہور اور ان کے نمائندوں کو بھی خدا شناسی اور خدا پرستی کا راستہ دکھلایا، اور بتایا کہ ملک کے حکام ہوں یا عوام اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے قانون کے سب پابند ہیں، عوام اور اسمبلیوں کے اختیارات، قانون سازی اور منصب داروں کا عزل و نصب اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود میں رہنا ضروری ہے، ان پر لازم ہے کہ امیر و سربراہ کے انتخاب میں، اور پھر عہدوں اور

اختیارات کی تقسیم میں، ایک طرف قابلیت و صلاحیت کی پوری رعایت کریں تو دوسری طرف ان کی دیانت و امانت کو پرکھیں، اپنا امیر و سربراہ یا نمائندہ ایسے شخص کو منتخب کریں جو علم خوف خدا، امانت و دیانت اور تجربے میں سب سے بہتر ہو، پھر یہ امیر بھی آزاد اور مطلق العنان نہیں بلکہ دیانت دار اہل رائے سے مشورہ لینے کا پابند رہے۔

خلافت راشدہ اس نظام شورائیت کا وہ حسین ترین نمونہ تھی جس نے مذہب و ملت، مقامی و غیر مقامی، امیر و غریب اور رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر ہر ایک کو حقیقی انصاف اور قابل عمل فطری مساوات عطا کی، اور پورے معاشرے کو معاشی اعتدال و توازن دیکر امن و امان اور چین و سکون کا گہوارہ بنادیا۔

ہاں دکھادے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

(۶) مشورے میں اختلاف رائے ہو جائے تو فیصلہ کیسے ہو؟

قرآن و سنت اور صحابہ کرام کے مسلسل عمل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اکثریت کی رائے کا پابند ہے، بلکہ یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اپنی صوابدید سے کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے، وہ خواہ اکثریت کے موافق ہو یا اقلیت کے، البتہ اپنا اطمینان حاصل کرنے کیلئے دیانت داری کے ساتھ جس طرح دوسرے دلائل پر نظر کرے گا، اسی طرح اکثریت کا ایک چیز پر متفق ہو جانا بھی بسا اوقات اس کیلئے سبب اطمینان بن سکتا ہے۔

جس آیت میں آنحضرت ﷺ کو مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے، اسی میں اس حکم کے فوراً بعد ارشاد ہے کہ ”فاذا عزمتم فتوکل علی اللہ“ یعنی مشورہ کے بعد جب آپ (کسی جانب کو ترجیح دے کر اس کا) عزم کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجئے، یہاں ”عزمتم“ کے لفظ میں ”عزم“ یعنی ”عمل کے پختہ ارادے“ کو صرف آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، ”عزمتم“ (تم لوگ عزم کر لو) نہیں فرمایا جس سے ”عزم“ میں صحابہ کرام کی شرکت معلوم ہوتی، اس کے اشارے سے ثابت ہوتا کہ مشورہ لینے کے بعد فیصلہ اور عزم صرف امیر ہی کا معتبر ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بہت مرتبہ حضرات شیخین صدیق اکبر اور فاروق اعظمؓ کی رائے کو جمہور صحابہ کی رائے پر ترجیح دی ہے، حتیٰ کہ ایک مرتبہ آپ نے ان دونوں حضرات کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

”لو اجتمعتما فی مشورۃ ما خالفتكما“^(۱)

”جب تم دونوں کسی رائے پر متفق ہو جاؤ تو میں تمہارے خلاف نہیں کرتا۔“

فاروق اعظمؓ بعض اوقات دلائل کے لحاظ سے اگر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی رائے زیادہ مضبوط ہوتی تھی تو ان کی رائے پر فیصلہ فرمادیتے تھے، حالانکہ مجلس میں اکثر ایسے صحابہ موجود ہوتے تھے جو ابن عباسؓ سے عمر علم اور تعداد میں بہت زیادہ ہوتے تھے۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ تو جمہوریت کے منافی، اور شخصی حکومت کا

(۱) رواہ احمد، و رجالہ ثقات، الا ان ابن غنم لم یسمع عن النبی ﷺ کذا فی مجمع

الزوائد، ص ۶ ج ۹، باب فیما ورد من الفضل لابی بکر و عمر

طرز ہے، اس سے عوام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ اسلامی آئین نے اس کی رعایت پہلی ہی کر لی ہے، کیونکہ عوام کو یہ اختیار ہی نہیں دیا کہ جس کو چاہیں امیر بنادیں، بلکہ ان پر لازم ہے کہ علم و عمل صلاحیت، خوف خدا اور دیانت میں جس شخص کو سب سے بہتر سمجھیں صرف اس کو امیر منتخب کریں، توجہ شخص ان اعلیٰ اوصاف کے تحت منتخب کیا گیا ہو اس پر ایسی پابندیاں لگانا جو بد دیانت اور فاسق و فاجر پر لگائی جاتی ہیں، عقل و انصاف کا خون کرنا اور کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی اور ملک و ملت کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

(۷) ہر کام میں تدبیر کے ساتھ اللہ پر توکل ضروری ہے

اس جگہ یہ بات ہی قابل توجہ ہے کہ نظام حکومت اور دوسرے اہم امور میں مشورے کے حکم کے فوراً بعد یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب کام کرنے کا عزم کرو تو اپنی عقل و رائے اور تدبیروں پر بھروسہ نہ کرو، بلکہ بھروسہ اور توکل صرف اللہ تعالیٰ پر کرو، کیونکہ مشورہ بھی ایک تدبیر ہے، اور تدبیروں کا موثر یا مفید ہونا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ چاہے تو زہر سے تریاق کا کام لے لے اور چاہے تو کسی کیلئے تریاق ہی کو زہر بنا دے، انسان کیا اور اسکی رائے اور تدبیر کیا، ہر انسان اپنی عمر کے ہزاروں واقعات میں اپنی تدبیروں کی رسوائی کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔

مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے:

خویش را دیدیم و رسوائی خویش
امتحان ما کن اے شاہ بیش

لیکن واضح رہے کہ توکل اسباب کو اختیار نہ کرنے اور تدبیر کو شش چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانے کا نام نہیں، بلکہ ایسا کرنا سنت انبیاء اور قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے، اس کتاب میں اسلحہ اور سامان جہاد کی تیاری کے قرآنی احکام اور آنحضرت ﷺ کی ہدایات پیچھے آچکی ہیں، خود مشورہ بھی ایک تدبیر ہے جس کا حکم قرآن و سنت کے حوالے سے ابھی بیان ہوا ہے، لہذا معقول تدابیر و اسباب کو شرعی حدود میں رہتے ہوئے اختیار کرنا، اور مناسب کو شش و جدوجہد کرنا ہر گز توکل کے خلاف نہیں، ہاں دور از کار اور موہوم تدبیروں کے پیچھے پڑنا یا صرف اسباب اور تدبیر ہی کو موثر اور کافی سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جانا بے شک خلاف توکل ہے۔^(۱)

☆☆☆

(۱) تفسیر معارف، القرآن ج ۲ ص ۲۲

اسلامی قانون شہادت اور ماہرین کی رپورٹیں

اسلامی قانون شہادت

اور

ماہرین کی رپورٹیں

(منقول از ماہنامہ البلاغ شمارہ صفر ۱۴۰۰ھ)

مندرجہ ذیل مقالہ آزاد کشمیر سے مولانا مفتی بشیر احمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا، یہ مسئلہ چونکہ موجودہ دور میں اسلامی قانون کی تطبیق سے تعلق رکھتا ہے، اور یہ سوالات عام طور سے ذہنوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس لئے افادہ عام کے لئے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے!

سوال:۔ کہیں ماہر ڈاکٹر کی شہادت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ شبہ یہ ہے کہ نصاب شہادت کے لئے کم از کم دو ڈاکٹروں کی شہادت ہونی چاہئے۔ مروجہ قوانین میں ایک ڈاکٹر کا دیا ہوا نتیجہ قبول کیا جاتا ہے اور خصوصاً زخموں کی اقسام، ان کی گہرائی اور سبب موت کے بارے میں ڈاکٹر کی بات پر ہی حجج کا فیصلہ ہوتا ہے، شرعاً کیا یہی صورت ہوگی؟

بَيْنُوا وَتُوجَرُوا!

المستفتی بشیر احمد

دار الافتاء باغ۔ ضلع پونچھ۔ آزاد کشمیر

۳۰ جولائی ۱۹۷۳ء

الجواب

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى. اَمَّا بَعْدُ

اس سوال کا جواب بہت تفصیل چاہتا ہے اس لئے کہ بہت سے مواقع میں فقہائے کرام نے نہ صرف اطباء کے قول کو بلکہ ہر علم و فن سے متعلق اس کے ماہرین کے قول کو اپنے اپنے محل میں ایک خاص حد تک حجت قرار دیا ہے۔ مثلاً خریدے ہوئے جانور کے جسمانی عیب کے بارے میں اگر بائع اور مشتری کا اختلاف ہو تو قاضی پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ متعلقہ ماہرین کی رائے معلوم کئے بغیر فیصلہ نہ کرے، چنانچہ معین الحکام میں ایک مستقل باب اس عنوان سے موجود ہے:- ”الباب التاسع والعشرون فى القضاء بقول اهل المعرفة“۔ اس باب کی ابتدائی عبارت یہ ہے۔

”يجب الرجوع الى قول اهل البصر والمعرفة من النخاسين
فى معرفة عيوب الرقيق من الاماء والعبيد وسائر
الحيوانات (ص ۱۶۲)“

اسی باب میں صاحب معین الحکام آگے فرماتے ہیں:-

”هل يحكم بقول النساء فيما يشهدن فيه من عيوب الاماء انه
قديم قبل تاريخ التبائع ام لا يسمع منهن فى ذلك ويشهد فى
ذلك الحكماء او النخاسون، قال بعضهم ان كن طبيبات
يسمع منهن والا فلا يشهدن به الا الحكماء (حوالہ بالا)“

جس کا حاصل یہ ہے کہ خریدی ہوئی باندیوں کے پوشیدہ جسمانی عیب کے بارے میں یہ فیصلہ کہ وہ عیب خریداری کی تاریخ سے پہلے کا ہے یا بعد کا، طبیب یا طبیبیہ ہی کے قول سے ہو سکتا ہے۔ معین الحکام (ص ۷۹) ہی میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ گواہوں کو علم کے بغیر گواہی دینا جائز نہیں، جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ گواہ کے لئے علم کے ذرائع کیا ہیں، وہیں ایک ذریعہ نظر واستدلال بھی ذکر کیا ہے، جس کی بناء پر کسی خاص فن کے ماہرین کو اس فن سے متعلقہ امور میں گواہی دینا جائز ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں

”الرابع، العلم المدرك بالنظر والاستدلال جائز كما يجوز بما علم من جهة الضرورة ومن ذلك شهادة الحكماء في قدم العيوب وحدوثها وشهادة اهل المعرفة في قدم الضرر وحدوثه (الى قوله) وبذا باب واسع“.

فتاویٰ انقرویہ (ص ۱۶۹ ج ۱) اور جامع الرموز للفتہانی (ص ۶۱۳ ج ۴) میں ”حکومتہ عدل“ کی ایک تفسیر یہ ذکر کی ہے کہ قاضی، ماہرین (طب) کے مشورے سے (زخم کا) جتنا معاوضہ مناسب سمجھے وہی حکومت عدل ہے۔ عبارت یہ ہے:-

”والاصح انه ما يرى القاضي بمشورة اهل البصر“

اگر کسی کی ضرب سے دوسرے کی آنکھ کی بینائی جاتی رہی اور مارنے والا کہتا ہو کہ بینائی باقی ہے تو آنکھ کے ماہرین سے معاینہ کر لیا جائے گا اور ان کی رپورٹ اس میں حجت ہوگی۔ چنانچہ عالمگیر یہ (ص ۶۹ ج ۶) میں ہے کہ

وتكلموا في ذهاب البصر (الى قوله) وقال محمد رحمه الله

تعالیٰ: ينظر الى البصر اهل البصر، وان لم يعلم ذلك يعتبر فيه الدعوى والانكار والقول للجاني مع البتات“

جرائم میں اصول یہ ہے کہ اگر کسی کا کوئی عضو جوڑ پر سے کاٹ دیا ہو تو مجرم سے اس عضو کا قصاص لیا جاتا ہے، امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ کان میں بھی کئی جوڑ ہوتے ہیں۔ پس اگر کان کا کچھ حصہ جوڑ پر سے کاٹا گیا ہو تو مجرم کا کان بھی اسی جوڑ سے کاٹ دیا جائے گا۔ رہی یہ تحقیق کہ کان میں واقعی جوڑ ہوتے ہیں یا نہیں تو فقہائے کرام نے اس کا فیصلہ ماہرین (اطباء) کی رائے پر چھوڑا ہے۔ پس اگر ماہرین کہیں کہ کان میں جوڑ ہوتے اور جوڑ ہی پر سے کان کاٹا گیا ہے تو مذکورہ بالا طریقے سے قصاص لیا جائے گا اور اگر اطباء کہیں کہ کان میں جوڑ نہیں ہوتے تو کان کا جتنا حصہ مجرم نے کاٹا ہے اتنا ہی حصہ مجرم کے کان کا کاٹا جائے گا، جوڑ کا اعتبار نہیں ہوگا۔ (عالمگیر یہ ص ۶۱۰ ج ۶)

ان چند مثالوں سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ فقہاء کرام نے بہت سے مواقع میں اطباء اور دوسرے فنون کے ماہرین کا قول حجت قرار دیا ہے۔ اگر قاضی اس فن کا ماہر نہیں تو اس پر لازم کیا ہے کہ وہ ماہرین سے ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد فیصلہ کرے۔

رہا یہ سوال کہ صرف ایک طبیب کا قول کافی ہو گا یا دو کا؟ نیز اس قول میں شرائط شہادت کا پایا جانا ضروری ہے یا نہیں؟ تو اس سوال کا تعلق ”واحد عدل“ کی شہادت یا خبر سے ہے، لہذا ”شہادت“ اور ”خبر“ کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام صورتوں کا جائزہ لینا ناگزیر ہے، جن میں فقہاء کرام نے صرف ”واحد عدل“ کی شہادت یا خبر کو کافی قرار دیا ہے، اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ہو سکے گا کہ کہاں ایک

طیب کی شہادت یا خبر کافی ہوگی، کہاں نہیں۔

طیب اور ڈاکٹر کا ایک ہی حکم ہے، اس لئے آگے ہم اختصار کے لئے صرف لفظ طیب ذکر کریں گے۔ پہلے شہادت کا مسئلہ بیان ہوگا، پھر خبر کا۔

شہادت کا مسئلہ

فقہائے کرام نے قرآن و سنت اور تعامل صحابہؓ کی روشنی میں شہادت کی چار اقسام بیان فرمائی ہیں:-

(۱) شہادت علی الزنا ☆ اس میں نصاب شہادت چار مرد ہیں، چار سے کم مردوں کی شہادت پر حد زنا ثابت نہیں ہو سکتی (۱)۔

لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿وَالَّذِينَ يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاَسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِنْكُمْ وَلِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِاَرْبَعَةٍ شُهَدَاءَ﴾

ولفظ اربعة نص في العدد والذكورة كما في البحر

(شرح مجلہ الاحکام العدلیۃ للشیخ محمد خالد الاتاسی رحمہ اللہ۔ ص ۲۰۲ ج ۵۔ مادہ ۱۶۸۵)

(۲) بقیہ حدود و قصاص میں شہادت ☆ اس میں نصاب شہادت کم از کم دو مرد ہیں، ایک مرد اور دو عورتیں بھی کافی نہیں۔ قصاص خواہ فی النفس ہو یا فیما دون النفس، دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔ (در مختار و شامی ص ۵۱۵ ج ۴) لقولہ الزہری رحمہ اللہ مضت السنۃ من لدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلیفتین من بعده ان لا شہادۃ للنساء فی الحدود

(۱) در مختار و شامی ص ۵۱۴ ج ۴۔ رد المحتار ص ۶۲ ج ۱۔

والقصاص۔ قال وشمل القصاص ما كان في النفس وما دونها. (شرح المجلہ ص ۱۵۳ و تکرار رد المحتار ص ۶۳ ج ۱)

(۳) بچے کی ولادت یا استہلال پر شہادت (برائے ثبوت (۱) نسب و میراث و صلوة جنازہ) اور عورتوں کے ان تمام امور پر شہادت کہ جن پر مرد مطلع نہیں ہوتے (مثلاً بکارت، ثبوت، حیض، حمل، اسقاط اور عورتوں کے عام پوشیدہ عیوب جیسے قرن رتق وغیرہ) ☆ ان میں نصاب شہادت ایک عاقل، بالغ، آزاد، مسلمان عورت ہے۔ (در مختار و شامی ص ۵۱۵ ج ۴، والمجلہ و شرحہ ص ۲۰۱ ج ۵ مادہ ۱۶۵، وتکرار ص ۶۲ ج ۱، و ہدایہ کتاب الشہادۃ ص ۱۵۴ ج ۳، معین الحکام ص ۱۱۷ الباب السابع فی القضاء بقول امرأۃ بافراہا) مرد کو چونکہ ان امور کا عہد مشاہدہ جائز نہیں فسق ہے، اس لئے مرد کے حق میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ کہے کہ ”میں نے قصداً مشاہدہ کیا تھا“، تب تو اس کی شہادت قبول نہ ہوگی اور اگر کہے کہ ”اچانک میری نظر اتفاقاً اس پر پڑ گئی“ تو شہادت قبول کر لی جائے گی بشرطیکہ عدل ہو، اگرچہ ایک ہو۔

ففي الدر المختار (۵۱۵ ج ۴ مع شامی):- وللولادة واستهلال الصبي للصلوة عليه وللاثر عندهما والشافعي واحمد وهو ارجح (قيد للارث واما في حق الصلوة فتقبل اتفاقا (شامی) والبكارة وعيوب النساء فيما لا يطلع عليه الرجال امرأة حرة مسلمة واثنان احوط. والاصح قبول رجل واحد قال الشامي تحته: قال في المنح: ”واشار بقوله: فيما لا يطلع عليه الرجال“ الى ان الرجل لو شهد لا تقبل شهادته“ وهو محمول على ما اذا قال: تعمدت النظر اما اذا شهد (۱) اس کی صراحت شرح المجلہ میں ہے۔

بالولادة وقال فاجأتها، فاتفق نظري عليها تقبل شهادته اذا كان عدلاً، كما في المبسوط.

بلکہ صاحب تکرملہ رد المحتار اور شارح المجملہ نے تو منہ عن السراج کے حوالے سے بعض مشائخ حنفیہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اگر مرد کہے کہ (تخل شہادت کی غرض سے) میں نے قصد اُدیکھا تھا تب بھی اس کی شہادت قبول کی جائے گی، مگر ان مشائخ کے نام دونوں نے ذکر نہیں کیے، البتہ زیلعی رحمہ اللہ سے اس قول کی تائید نقل کی ہے، فرماتے ہیں کہ

وفي الزيلعي ما يفيد ارجحية القبول وان تعمد النظر لاجل

تحمل الشهادة افاده في التكملة (شرح المجملہ ۲۰ ج ۵

مادہ ۸۸ - ۱، وتفصيل كلام الزيلعي يطلب من تكملة رد

المحتار ص ۶۵ ج ۱)

اور صاحب تکرملہ رد المحتار کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ثقہ مرد کی شہادت ان امور میں قبول کی جائے گی بشرطیکہ اس نے تخل شہادت اور احیاء حق کی نیت سے دیکھا ہو^(۱)۔ اور ظاہر ہے کہ عدالت کے حکم پر ان امور کا معاینہ طبیب یا ڈاکٹر اسی غرض سے کرتا ہے، اس لئے حاصل یہ نکلتا ہے کہ ایک طبیب یا ڈاکٹر (مرد) کی شہادت ان امور میں قبول کی جائے گی

(۱) اس مسئلے کی کچھ تفصیل معین الحکام میں بھی مذکور ہے۔ صاحب معین الحکام کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ثقہ مرد کی شہادت قبول کی جائے گی دلیل اور اعتراض کا جواب دیں ملاحظہ کیا جائے۔ فی القضاء لقول رجل بانفراده ص ۱۱۶ نیز حاشیہ ہدایہ میں بھی جواز پر جزم کیا گیا ہے۔ (کتاب الشہادۃ ص ۵۴ ج ۳) نیز فتح القدیر میں ابن الہمام نے بھی ولادت کے بارے میں نقل فرمایا ہے کہ وقال بعض مشائخنا قال تعمدت النظر قبل البصاویہ قال بعض اصحاب الشافعی (ص ۱۰ ج ۶)

بشرطیکہ وہ عدل ہو یعنی کبار سے اجتناب کرتا ہو اور صغائر پر اصرار نہ کرتا ہو۔

(۴) مذکورہ بالا تین اقسام کے علاوہ باقی حقوق العباد میں شہادت ☆ اس کا نصاب دو مرد، یا ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔ حقوق خواہ مالیہ ہوں یا غیر مالیہ مثلاً نکاح، طلاق، وکالت، وصیت، قتل خطا اور ایسا ہر قتل جو موجب قصاص نہیں، ان سب کا نصاب شہادت یہی ہے۔ (الدر المختار مع شامی ص ۵۱۵ ج ۴، المستملہ ص ۶۹ ج ۱، وشرح المجملہ ص ۲۰۲ ج ۵ مادہ ۵۱۵ ج ۴)

البتہ اس قسم سے دو صورتیں مستثنیٰ ہیں: (۱) شہادت کسی تعلیم گاہ یا تربیت گاہ کے نابالغ بچوں کے حوادث سے متعلق ہو تو اس میں صرف ایک معلم کی شہادت کافی ہوگی۔ (۲) زنانہ حمام میں کوئی قتل ہو جائے تو اس پر صرف عورتوں کی شہادت ثبوت دیت کی حد تک کافی ہوگی، قصاص اس سے بھی ثابت نہ ہو سکے گا۔ (شہادت دینے والی عورتوں کی تعداد کیا ہوگی؟ اس کی صراحت کتب فقہ میں نہیں ملی، البتہ الشیخ عبدالقادر عودہ نے التشریع الجنائی (ص ۴۴ ج ۲) میں کہا ہے کہ فقہاء حنفیہ اس صورت میں صرف ایک عورت کی شہادت کو کافی قرار دیتے ہیں، افسوس ہے کہ انہوں نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا)

ان دونوں مستثنیٰ صورتوں کی وجہ وہی ہے جو عیوب نساء کے مسئلے میں ہے کہ بچوں کی تعلیم میں عموماً ایک ہی استاذ ہوتا ہے، دوسرے لوگوں کا ان امور پر مطلع ہونا مشکل ہے اور عورتوں کے حمام میں مرد نہیں ہوتے، پس ان دونوں استثناء کی صورتوں میں بھی اگرچہ حدود و قصاص ثابت نہیں ہو سکتے، مگر دوسرے حقوق میں یہ شہادت معتبر ہوگی تاکہ حقوق ضائع نہ ہوں اور خون رائیگاں نہ جائے، درمختار کی عبارت یہ ہے:-

ونصابها لغيرها من الحقوق سواء كان الحق مالا او غيره
كنكاح وطلاق ووكالة ووصية (الى قوله) رجلان الا في
حوادث صبيان المكتب فانه يقبل فيها بشهادة المعلم
منفردا، قهستاني عن التجنيس او رجل وامرأتان (وقال قبل
اسطر) وفي البرجندی عن الملتقط ان المعلم اذا شهد
منفردا في حوادث الصبيان تقبل شهادته اهـ فليحفظ.

(در مختار مع شای ص ۵۱۵ و ۵۱۶ ج ۴)

جمع الفوائد (ص ۲۸۸ ج اول، حدیث نمبر ۴۹۴۳) میں حضرت عبداللہ بن
الزبیر رضی اللہ عنہ کا یہ معمول بیان کیا گیا ہے کہ

”كان ابن الزبير يقضى بشهادة الصبيان فيما بينهم من
الجراح“ (المالك)

اور تكملة رد المحتار (ص ۶۵ ج ۱) میں ہے کہ

ذكر الحموي رحمه الله في شرحه عن الحاوي القدسي
تقبل شهادة النساء وحدهن في القتل في الحمام في حكم
الدية لئلا يهدر الدم. ومثله في خزانة المفتين.

اور شرح المجله (ص ۲۰۲ ج ۵، مادہ ۱۶۸۵) میں ہے کہ

وشمل القصاص ما كان في النفس وما دونها. وقيد
بالقصاص لما في الخانية ولو شهد رجل وامرأتان في قتل
الخطا او بقتل لا يوجب القصاص تقبل شهادتهم وكذا

الشهادة على الشهادة وكتاب القاضي الى القاضي لان
موجب هذه الجنابة المال فتقبل فيه شهادة النساء مع
الرجل اهـ۔

اور چونکہ یہ چاروں قسمیں شہادت کی ہیں اس لئے ان میں وہ تمام شرائط
لازم ہوں گی جو شہادت کے لئے مقرر ہیں۔ مثلاً گواہ کا عدل ہونا، حاضر عدالت
ہونا اور لفظ اَشْهَدُ^(۱) وغیرہ البتہ اگر قاضی نے غیر عدل کی گواہی پر فیصلہ کر دیا تو
فیصلہ نافذ ہو جائے گا مگر قاضی گنہگار ہو گا۔ اور اگر حکومت کی طرف سے قاضی کو
غیر عدل کی شہادت پر فیصلہ کرنے کی ممانعت ہو تو فیصلہ نافذ بھی نہیں ہو گا۔
در مختار کی عبارت اس سلسلے میں یہ ہے :-

ولزم في الكل اى من المراتب الاربع لفظ اشهد بلفظ
المضارع بالاجماع وكل مالا يشترط فيه هذا اللفظ
كطهارة ماء ورؤية هلال فهو اخبار لاشهادة لقبولها
والعدالة لوجوبه (الى قوله) لالصحة خلافاً للشافعي رضى
الله تعالى عنه فلو قضى بشهادة فاسق نفذ واثم، فتح. الا ان
يمنع منه اى من القضاء بشهادة الفاسق الامام فلا ينفذ
لما مر انه يتأقت ويتقيد بزمان ومكان وحادثة وقول معتمد
حتى لا ينفذ قضائه باقوال ضعيفة۔ (ص ۵۱۶ ج ۵)

(۱) خلافاً للعراقيين فانهم لا يشترطون الشهادة في النساء فيما لا يطلع عليه الرجال فيجعلونها من
باب الاخبار لا من باب الشهادة الصحيح هو الاول لانه من باب الشهادة وانها شرط فيه شرائط
الشهادة من الحرية ومجلس الحكم وغيرها. (تكملة رد المحتار ص ۲۷ ج ۱)

خلاصہ بحث

خلاصہ بحث یہ ہے کہ شہادت سے جو امور ثابت ہوتے ہیں، ان کی کل چار قسمیں ہیں:-

(۱) حد زنا،

(۲) قصاص اور بقیہ حدود،

(۳) عورتوں کے مخصوص پوشیدہ امور کہ جن پر مرد عموماً مطلع نہیں ہوتے،

(۴) ان تین کے علاوہ باقی حقوق العباد۔

ان میں قسم اول و دوم کے ثبوت کے لئے تو صرف ایک طبیب یا ڈاکٹر کی شہادت کسی حال کافی نہیں لہذا اس سے نہ کوئی حد ثابت ہو سکتی ہے، نہ قصاص، قصاص خواہ جان کا ہو یا کسی عضو کا۔

تیسری قسم میں ایک ثقہ طبیب یا لیڈی ڈاکٹر، دایہ یا نرس یا کسی بھی ایک دیانت دار عورت کی شہادت کافی ہے اور اگر ایک طبیب یا ڈاکٹر یا کوئی اور مرد یوں کہے کہ اس واقعے پر میری نظر اچانک اتفاقاً پڑ گئی تو اس کی شہادت بھی کافی ہے۔ بلکہ حافظ زلیعی رحمہ اللہ صاحب معین الحکام، مولانا عبدالحی لکھنوی اور صاحب تکرملہ وغیرہم کے کلام سے یہ گنجائش بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ کہے کہ میں نے (گواہ بننے کی نیت سے) قصد اذیکھا تھا تب بھی ایک مرد کی شہادت قبول

ہوگی۔

اور چوتھی قسم میں عام حالات میں تو صرف ایک طبیب یا ڈاکٹر کی شہادت کافی نہیں، بلکہ دو مرد یا مرد اور دو عورتیں ضروری ہیں۔ لیکن اسی قسم میں تعلیم گاہ کے بچوں کے معاملات میں صرف ایک معلم کی اور قتل فی حمام النساء میں صرف عورتوں کی شہادت کو جو فقہائے کرام نے حجت قرار دیا ہے، ان دو استثنائی صورتوں میں غور کرنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حقوق العباد میں اگر کچھ مزید صورتیں ایسی پیش آئیں کہ جن پر عموماً ایک سے زیادہ اشخاص کا گواہ بننا عادتاً معذور ہو تو ان میں بھی صرف ایک طبیب یا ڈاکٹر کی شہادت قبول کی جانی چاہئے کیونکہ حدود و قصاص کے علاوہ باقی امور میں جہاں اصل نصاب شہادت پورا ہونا عادتاً معذور تھا فقہاء کرام نے تخفیف سے کام لیا ہے عورتوں کے مخصوص پوشیدہ امور میں صرف ایک عورت یا ایک مرد کی شہادت، تعلیم گاہ کے بچوں کے معاملات میں صرف ایک معلم کی شہادت اور قتل فی حمام النساء میں صرف عورتوں کی شہادت کو قبول کرنا اس کی واضح مثالیں ہیں، اور وجہ یہی ہے کہ یہ تینوں مثالیں حقوق العباد سے متعلق ہیں، اگر تخفیف نہ کی جائے تو ان حقوق کا اطلاق لازم آجائے گا، لہذا ان مثالوں پر انہی جیسی دوسری مثالوں کو قیاس کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، مثلاً یوں کہا جاسکتا ہے کہ جو حکم عورتوں کے حمام کا ہے، وہی اس زچہ خانہ یا زنانہ ہسپتال یا زنانہ تعلیم گاہ کا ہو گا جس میں مردوں کا عمل دخل نہ ہو۔

مگر اس گنجائش کی کوئی صراحت فقہاء کے کلام میں احقر کو نہیں ملی۔ اگر مل جائے فہما، ورنہ ایسی صورتوں کو معین و مشخص کر کے علماء اہل فتویٰ کے باہمی مشورے سے ان کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے۔

اب ضرورت دو چیزوں کی ہے، ایک یہ کہ ایسی مزید صورتیں معین و مشخص کی جائیں جن میں ایک سے زیادہ طبیبوں یا ڈاکٹروں کا گواہ بننا واقعی مستحضر ہو تا ہو، اور دوسری یہ کہ ان صورتوں کو علماء اہل فتویٰ کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ اجتہاد فی المسائل کی بنیاد پر ان کا حکم واضح فرما سکیں۔

خبر کا مسئلہ

یہ سب تفصیل شہادت سے متعلق تھی، رہا خبر کا مسئلہ، تو اس میں شہادت جیسی کڑی پابندیاں نہیں، اس کی بیشتر صورتوں میں صرف ایک شخص کی خبر کو کافی قرار دیا گیا ہے، حتیٰ کہ معاملات میں تو ایک فاسق یا کافر کی خبر قبول کی جاتی ہے، خواہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، بشرطیکہ ظن غالب یہ ہو کہ یہ سچ بول رہا ہے۔ البتہ دیاناتِ محضہ میں خبر دینے والا شخص کا عدل ہونا ضروری ہے، کافر یا فاسق کی خبر کافی نہیں۔ (کذا فی الہدایۃ فی کتاب الکراہیۃ ص ۵۲ ج ۳ و تکملۃ رد المحتار ص ۱۶۷ ج ۱)

نیز قاضی کو فیصلے پر پہنچنے یا فیصلے کی بعض تفصیلات طے کرنے کے لئے با اوقات ایسی چیزوں کی تحقیق کرنا پڑتی ہے جن کا ثبوت شہادت پر موقوف نہیں، ایسی چیزوں میں بھی ”واحد عدل“ کی خبر کو فقہاء کرام نے کافی قرار دیا ہے چنانچہ ہدایہ (کتاب الکراہیۃ ص ۵۲ ج ۳) میں ایسی کئی صورتیں مذکور ہیں اور معین الحکام میں تو ایک مستقل باب الباب السادس فی القضاء بقول رجل بانفرادہ کے عنوان سے موجود ہے^(۱)۔ (ص ۱۱۵)

نیز رد مختار میں بھی الاشباہ کے حوالے سے ایسی بارہ صورتیں یکجا ذکر کی گئی

(۱) اس سلسلے میں معین الحکام میں اسی مقام پر یہ کلیہ بھی درج ہے کہ قال بعضهم ویکنی الشاهد العدل فیما یتددی الحاکم فیہ بسوال وفیما کان علما یؤدبہ۔

ہیں، ان سب کا تعلق قضاء سے ہے مگر ان کا ثبوت شہادت پر موقوف نہ ہونے کی وجہ سے ان میں صرف ایک ثقہ مرد کی خبر کو قبول کر لیا جاتا ہے، ان میں خبر دینے والے کا حاضر عدالت ہونا یا لفظ ”أشهد“ کہنا بھی ضروری نہیں۔ موت، جسمانی عیوب و امراض، زخموں کی اقسام، ان کی گہرائی اور ان پر مرتب ہونے والے ثاوان (ارش) کی تشخیص و تعیین بھی انہی امور میں سے قرار دی گئی ہے، لہذا ایک قابل اعتماد دین دار جراح یا سرجن کی رپورٹ ان میں کافی ہوگی۔ در مختار کی عبارت اس سلسلے میں درج ذیل ہے (ص ۵۱۹ ج ۴ کتاب الشہادات) :-

وکفی عدل واحد فی اثنی عشر مسئلة علی ما فی الاشباہ
(الی قولہ) وقد نظم ابن وہبان منها احد عشر فقال

ویقبل عدل واحد فی تقوم
وجرح وتعديل وآرش یقدر
وترجمة والسلم هو جید
افلاسه الارسال والعیب یطهر
وصوم علی مامر او عند علة
وموت اذا للشاهدین ینخبر

قال الشامی تحته والثانیۃ عشر قول امین القاضی اذا اخبر
بشهادة شهود علی عین تعذر حضورها کما فی دعوی

القنیۃ. (اشباہ. مدنی)

رد مختار میں یہ صورتیں مجمل ہیں، ان کی شرح رد المحتار میں اور تکملہ رد المحتار اور شرح المجملہ^(۲) میں دیکھی جاسکتی ہے، نیز ہدایہ (باب الکراہیۃ)

(۱) ص ۷۹ تا ۸۱ ج ۱۔ (۲) ص ۲۰۱ تا ۲۰۵ ج ۵ تحت المادة ۱۶۸۵۔

اور معین الحکام (الباب (۱) السادس فی القضاء بقول رجل بانفرادہ) میں بھی ان میں سے اکثر کی تفصیلات موجود ہیں۔ مذکورہ بالا کتب اور بعض دوسری کتب فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوع کی خبر کا انحصار انہی بارہ صورتوں میں نہیں، بعض دوسری جزئیات بھی اس نوع کی ملتی ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر ضمنی طور پر آگے آئے گا۔

در مختار کی بیان کردہ بارہ صورتوں میں سے چار صورتیں ایسی ہیں جن میں طبی رپورٹ کی ضرورت پیش آتی ہے یا آسکتی ہے:- (۱) عیب (۲) تقوّم (۳) آرش (۴) موت۔ ان کی جو تشریح در مختار وغیرہ میں ملتی ہے یہاں نقل کی جاتی ہے، پھر ان کے متعلق ضروری تفصیل فقہی جزئیات کی روشنی میں بیان کی جائے گی:-

(۱) ب: قال الشامي في رد المحتار قوله "والعيب يظهر" ای فی اثبات العيب الذي يختلف فيه البائع والمشتري (وقال صاحب التكملة: يكتفي في اثباته بقول عدل ويظهر من الاظهار)

اس سے معلوم ہوا کہ در مختار کی عبارت "والعيب يظهر" کا مطلب یہ ہے کہ کسی بیع کے عیب دار ہونے نہ ہونے میں اگر بائع اور مشتری کا اختلاف ہو جائے اور واحد عدل اس کے معاینہ کے بعد خبر دے کہ اس میں واقعی فلاں عیب موجود ہے تو عیب کا وجود ثابت ہو جائے گا، اس قاعدہ کلیہ کا تقاضہ یہ ہے کہ بائع اور مشتری کا اختلاف اگر خریدے ہوئے جانور، غلام یا باندی کے کسی جسمانی

عیب یا بیماری سے متعلق ہو اور اس کے ثبوت کے لئے طبی معاینہ کی حاجت محسوس کی جائے تو اس میں صرف ایک دیانت دار (عدل) طبیب کی رپورٹ کو حجت قرار دیا جائے گا۔

(۲) تقوّم: قال الشامي في رد المحتار قوله في تقوّم ای تقوّم الصيد والمتلفات، وفي التكملة قوله في تقوّم ای تقوّم الصيد الذي اتلفه المحرم وكذا في متلف بان كسر شخص لشخص شيئا فادعى ان قيمته مبلغ كذا فانكر المدعى عليه ان يكون ذلك القدر فيكفي في اثبات قيمته قول العدل الواحد وذكر في البزاية من خيار العيب انه يحتاج الى تقويم عدلين لمعرفة النقصان فيحتاج الى الفرق بين التقويمين (ای تقويم المتلفات وتقويم النقصان الذي يثبت في المبيع. رفيع) ويستثنى من كلامه تقويم نصاب السرقه فلا بد فيه من اثنين كما في العناية.

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی کوئی چیز توڑ دے اور مالک دعویٰ کرے کہ اس کی قیمت اتنی تھی اور مجرم کہتا ہو کہ قیمت اس سے کم تھی تو اس صورت میں قیمت کا اندازہ واحد عدل سے کرایا جائے گا اور اس کا قول کافی سمجھا جائے گا۔ اس قاعدہ کلیہ کا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ توڑی ہوئی چیز کسی جانور کا عضو ہو یا کسی کے جانور کو کسی نے زخمی کر دیا ہو یا کسی کی ضرب سے اس جانور کو کوئی مرض لاحق ہو گیا ہو تو اس صورت میں چونکہ نقصان قیمت کا اندازہ اس پر موقوف ہے کہ وہ زخم کس نوعیت کا اور کتنا گہرا ہے، اس لئے طبی معاینہ کی ضرورت ہوگی اور اس میں ایک قابل اعتماد طبیب کا قول حجت ہوگا۔

(۳) ارش: قال صاحب التكملة: قوله: وارش^(۱) يقدر،

ای فی نحو الشجاج۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے دوسرے انسان کو زخمی کر دیا تو زخم کا ارش (جرمانہ) جو مجرم کی طرف سے زخمی کو دلوایا جائے گا، اس کی مقدار کا تعین واحد عدل سے کرایا جائے گا اور اس کا قول کافی سمجھا جائے گا۔

(۴) موت: قال الشامي في رد المحتار وكذا في التكملة

قوله: موت ای موت الغائب قوله اذا للشاهدين يخبر ای اذا

شهد عدل عند رجلين علی موت رجل وسمعهما ان يشهد

اعلی موته۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی غائب شخص کی موت کی خبر اگر کوئی واحد عدل دو آدمیوں کو سنائے تو اس خبر کی بنیاد پر سننے والے دو مردوں کو قاضی کے سامنے شہادت دینا جائز ہے کہ ”فلاں شخص مر گیا ہے“ اگرچہ اس کی موت کا مشاہدہ ان کو انہوں نے نہیں کیا اس قاعدہ کلیہ کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اگر کسی مریض کی موت کی خبر کوئی طبیب دے تو سننے والوں کے لئے اس خبر کو کافی سمجھا جائے گا اور ان کو قاضی کے سامنے مرنے والے کی موت کی شہادت دینا جائز ہے۔

حاصل یہ کہ در مختار کی زیر بحث عبارت سے مستفاد ہوا کہ ایک طبیب کی رپورٹ مندرجہ ذیل امور میں حجت ہوگی:-

(۱) خریدے ہوئے جانور، غلام یا باندی میں جسمانی عیب یا مرض کے متعلق جب کہ بائع اور مشتری میں اختلاف ہو جائے۔

(۱) ارش کی مفصل تشریح و تعریف کے لئے ملاحظہ ہو التشریح الجہانی ص ۶۷۱ ج ۱۔

(۲) کسی جانور کے جسمانی نقصان کے متعلق جو کسی سے زخم لگائے یا چوٹ مارنے سے پیدا ہو گیا ہو، تاکہ جس کا نقصان ہوا ہے، اسے معاوضہ دلایا جاسکے۔

(۳) کسی انسان کے جسمانی نقصان کے متعلق جو کسی کی ضرب سے پیدا ہو گیا ہو، تاکہ نقصان کا معاوضہ دلایا جاسکے۔

(۴) کسی کی موت کے متعلق۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مسائل میں ایک طبیب وغیرہ کی طبی رپورٹ کس حد تک مؤثر ہے، اس میں کیا تفصیلات ہیں۔ ہر مسئلے کے متعلق جو تفصیلات کتب فقہ میں مل سکی ہیں، ان کا خلاصہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔



جسمانی عیوب و امراض کے متعلق طبی رپورٹ کی عدالتی حیثیت

در مختار اور شامی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ قاعدہ کلیہ سے جو بات اجمالی طور پر مستفاد ہوئی تھی کہ خریدے ہوئے جانوروں، غلاموں اور باندیوں کے جسمانی عیوب و امراض کی تشخیص کے لئے ایک طبیب کی خبر کافی ہوگی، معین الحکام نے اس کی صراحت کر دی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان سب کو معائنے کے لئے حاضر عدالت ہونا ضروری نہیں بلکہ جس جانور یا غلام وغیرہ کے عیب یا مرض کی تشخیص مطلوب ہے، اسے معائنے کے لئے عدالت متعلقہ ماہر طبیب کے پاس بھیج کر رپورٹ طلب کر لے تو یہ بھی جائز ہے۔

تنبیہ

صاحب معین الحکام ہی نے قاضی خان کے حوالے سے ایک اہم بنیادی اصول یہ بیان کیا ہے کہ اس طبی رپورٹ سے صرف اتنا ثابت ہوگا کہ اس جانور وغیرہ میں فلاں جسمانی عیب یا مرض موجود ہے، رہا یہ سوال کہ عیب کی ذمہ داری بائع پر ہے یا مشتری پر؟ تو اس کا فیصلہ صرف شہادت ہی سے ہو سکتا ہے، طبی رپورٹ اس کے لئے کافی نہیں۔ پس اگر دو گواہوں کی باضابطہ شہادت سے ثابت ہو گیا کہ یہ عیب بیع سے پہلے ہی بیع میں موجود تھا تو اس کی ذمہ داری بائع پر ڈالی جائے گی اور مشتری چاہے تو بیع کو فسخ کر دیا جائے گا (یا بعض صورتوں میں اس نقصان کا عوض مشتری کو دلایا جائے گا) فقہائے کرام نے یہ بات اصطلاحی الفاظ

میں اس طرح بیان فرمائی ہے کہ یہ خبر صرف توجہ خصوصیت کے لئے معتبر ہے، الزام خصم کے لئے کافی نہیں، معین الحکام کی عبارات درج ذیل ہیں:-

وما اختصم فيه من العيوب التي تكون في العبد المبيع
فالحاكم اذا تولى الكشف فطريقه ان يرسل بالعبد الى من
يرتضيه او يثق ببصره ومعرفته بذلك العيب وغوره مثل
الشقاق والطحال والبرص المشكوك وامثال ذلك كثيرة،
فياخذ فيه بالخبر الواحد بقول الطبيب النبيل، كذا نقل عن
بعض المتأخرين. (الباب السادس في القضاء بقول رجل
بانفراده ص ۱۱۵)

وفيه (في الباب المذكور) ما بطن من العيوب في حيوان
وقن وامة فالطريق هو الرجوع الى اهل البصر، ان اخبر
واحد عدل بثبت العيب في حق الخصومة. وان شهد به
عدلان وشهد انه كان عند البائع يرد عليه. قاله قاضيخان.

☆☆☆

شوہر کے محبوب ہونے کے متعلق بھی ایک شخص کی خبر کافی ہے

جسمانی عیب ہی کے سلسلے کی ایک اور صورت جو خریدے ہوئے جانوروں وغیرہ کے علاوہ ہے، یہ ہے کہ اگر عورت دعویٰ کرے کہ اس کا شوہر محبوب ہے اور شوہر (خواہ غلام ہو یا آزاد) اس کا انکار کرے اور کپڑوں کے اوپر سے چھونے سے حقیقت حال واضح نہ ہوتی ہو تو قاضی کسی معتبر شخص کو مامور کرے گا کہ وہ اس کا معائنہ کر کے بتلائے کہ عورت سچ کہتی ہے یا مرد سچا ہے۔

یہ صورت علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الطلاق میں خانیہ کے حوالے سے نقل کی ہے، ان کی عبارت یہ ہے:-

(تتمہ) لو اختلفا فی کونہ محبوبا فان کان لا یعرف باللمس
من وراء الثیاب امر القاضی امینا ان ینظر الی عورتہ فیخبر
بحالہ لانه یباح عند الضرورة^(۱) (خانیہ).

تنبیہ

یاد رہے کہ جو حکم یہاں محبوب کا بیان ہوا ہے وہ عنین کے مسئلے میں جاری نہیں ہوگا کیونکہ جب عورت دعویٰ کرے کہ اس کا شوہر عنین ہے اور شوہر انکار کرے تو اس کا فیصلہ شوہر کے طبی معاینے یا طبیب کی رپورٹ سے نہیں ہوگا، بلکہ اس کے فیصلے کا طریق کار دوسرا ہے جس کی تفصیل الحیلۃ الناجزہ^(۲) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۱) کتاب رد المحتار - باب العنین وغیرہ - ص ۸۱ ج ۲۔

(۲) حیلۃ ناجزہ - حکم زوجہ عنین۔

جرائم میں زخموں کے متعلق طبی جائزہ کی عدالتی حیثیت

اتنی بات تو پیچھے معلوم ہو چکی ہے کہ جرائم میں زخموں کا جو ارش (معاوضہ) کی طرف سے زخمی کو دلویا جاتا ہے اس کی مقدار معین کرنے کے لئے واحد عدل کا قول کافی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا قول صرف ارش کی مقدار معین کرنے تک محدود ہوتا ہے بلکہ یہ معین کرنا چونکہ زخم کی نوعیت اور گہرائی وغیرہ کی تشخیص پر موقوف ہے، اس لئے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اس تشخیص میں جہاں جہاں طبیب کی رپورٹ کی ضرورت ہو، وہاں طبیب سے معائنہ کرایا جائے گا اور اس کا قول اس تشخیص میں بھی حجت ہوگا اور یہ قول چونکہ خبر ہے شہادت نہیں لہذا اس میں شرائط شہادت کی پابندی بھی ضروری نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ نتائج و احکام کے اعتبار سے زخموں اور جسمانی نقصانات کی بنیادی قسمیں تین ہیں:-

(۱) وہ زخم یا جسمانی نقصان جس کا قصاص مجرم سے لیا جاتا ہے یعنی اس کے مماثل زخم یا جسمانی نقصان مجرم کو پہنچایا جاتا ہے۔

(۲) وہ زخم وغیرہ جس کا قصاص تو نہیں لیا جاسکتا مگر اس کے معاوضہ (ارش) میں مال کی کوئی خاص مقدار جو شریعت نے مقرر کر دی ہے، زخمی کو مجرم کی طرف سے دلوائی جاتی ہے۔

(۳) وہ زخم وغیرہ جس کے معاوضہ (ارش) کی کوئی خاص مقدار شریعت نے مقرر نہیں کی بلکہ اس مقدار کا تعین واحد عدل سے کر کے قاضی وہی مقدار

زخمی کو دلوانے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

کتب فقہ کے نتیجے اور ان میں غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں قسموں میں جہاں جہاں فقہاء کرام نے اس جسمانی نقصان کی نوعیت، کیفیت مقدار اور زخموں کی گہرائی وغیرہ کی تشخیص کے لئے طبی معائنے کی حاجت محسوس کی، وہاں ایک قابل اعتماد طبیب کی رپورٹ کو حجت قرار دیا ہے، حتیٰ کہ جس جسمانی نقصان کے نتیجے میں قصاص لازم ہوتا ہو اس کی تشخیص و تعیین میں بھی ایک طبیب کا قول تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ اگر کسی نے دوسرے کے دانت کا کچھ حصہ عرضاً (چوڑائی) میں توڑ دیا ہو تو مجرم کا بھی اتنا ہی دانت چوڑائی میں ایک مخصوص آلے کے ذریعے گھس دیا جائے گا جسے ”مبرد“ کہا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کہ مجرم نے دانت کا کتنا حصہ توڑا تھا ایک ماہر طبیب سے کرایا جائے گا اور اس کا قول اس میں حجت ہوگا۔ فتاویٰ انقرویہ، عالمگیریہ اور شامی کی عبارات اس سلسلے میں یہ ہیں:-

فی الانقروية^(۱) والابراد (ای ابراد السن) احتیاط لئلا
یؤدی الی فساد اللحم وفي الكسر ينظر الی المكسور مالم
کم الذاهب؟ فبرد منها ذلك القدر.

وفي الهندية^(۲) وفي المنتقى اذ کسر من سن رجل طائفة
منها، انتظر منها حولا فاذا تم الحول ولم يتغير فعلیه
القصاص ویرد بالمبرد ویطلب لذلك طبیب عالم ویقال له
قل لنا کم ذهب منها؟ فان ذهب النصف یرد من سن الفاعل

(۱) ص ۱۶۸ ج ۱۔

(۲) یعنی عالمگیریہ۔ صفحہ ۱۱ جلد ۶۔

النصف، کذا فی المحيط.

قال الشامی^(۱) وفي البزازیة قال القاضی الامام ”وفي کسر
بعض السن انما یرد بالمبرد اذا کسر عن عرض اما لو عن
طول فقیه الحکومة اه شربلا لیه، وفي التاتارخانیة ”ان کسر
مستویا یمکن استیفاء القصاص منه اقتص والا فعلیه ارش
ذلك.

اور جب اعضاء انسانی کے قصاص میں ایک طبیب کی رپورٹ کافی سمجھی گئی
ہے تو جن جسمانی نقصانات پر قصاص کے بجائے ارش (مالی تاوان) واجب ہوتا
ہے، ان میں تو ایک طبیب کی رپورٹ بدرجہ اولیٰ کافی ہوگی، چنانچہ پیچھے کئی
عبارات ارش کے متعلق بھی آچکی ہیں۔ واللہ اعلم

کتبہ محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

(۱) رد المحتار صفحہ ۳۸۷ جلد ۵ کتاب الجنایات، باب القود فی ابدان النفس۔

اگر زنا کے گواہوں میں کوئی گواہ گواہی سے انحراف
کرے تو مسئلے کی نوعیت کیا ہوگی؟

پر نہیں۔

۲..... اور اگر گواہوں نے اپنی گواہی سے رجوع حد جاری کرنے کے بعد کیا تو اس کی دو صورتیں ہیں: حد یا رجم ہوگی، یا جلد (کوڑے لگانا):

الف: رجم کی صورت میں رجوع کرنے والا گواہ اگر ایک ہے، تو صرف اسی گواہ پر حد قذف جاری کی جائے گی، اور وہ دیت کی ایک چوتھائی کا ضامن بھی ہوگا، اور اگر سب گواہوں نے اپنی گواہی سے رجوع کیا، تو سب پر حد قذف جاری ہوگی، اور ہر ایک چوتھائی دیت کا ضامن ہوگا۔

حنفیہ کے ساتھ گواہوں پر حد قذف جاری کرنے کے اس مسئلہ میں حنابلہ بھی متفق ہیں، البتہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ رجوع کرنے کی صورت میں صرف رجوع کرنے والے پر حد قذف لگے گی، دوسروں پر نہیں۔

ب: اور اگر یہ حد جلد (کوڑے لگانا) تھی تو حد قذف کی حد تک تو اس میں بھی وہی تفصیل ہے، جو اوپر گزر گئی، البتہ اس جلد (کوڑے لگانے) سے اگر وہ زخمی ہو گیا، یا مر گیا، تو حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا کوئی ضمان واجب نہیں، نہ گواہوں پر اور نہ بیت المال پر، اور صاحبینؒ کے نزدیک تاوان (دیت یا ارش) بیت المال سے اداء کرنا واجب ہوگا۔

رجم کی صورت میں یا جلد کی صورت میں اگر ملزم مر گیا، اور گواہوں نے رجوع کر لیا، تو حنابلہ، شافعیہ اور بعض مالکیہ کے نزدیک اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر گواہ اپنی شہادت سے رجوع کریں، اور ساتھ یہ کہیں کہ ہم نے جان بوجھ کر اس طرح کیا، تو گواہوں پر قصاص یا دیت مغالطہ (جس کی تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں) لازم ہوگی، اور اگر وہ کہیں کہ ہم نے غلطی سے اس طرح کیا، تو اس صورت میں ان پر دیت مخففہ (جس کی تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں) واجب ہوگی۔ (ملاحظہ ہوں فقہی

س۔ اگر زنا کے گواہوں میں کوئی گواہ گواہی سے انحراف کرے تو مسئلے کی نوعیت کیا ہوگی؟ (اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامداً ومصلیاً

ابتداءً اس مسئلہ کی دو صورتیں ہیں:

(۱) کسی ایک گواہ یا سب گواہوں نے رجوع حد (حد رجم ہو، یا جلد یعنی کوڑے لگانے ہوں) جاری کرنے سے قبل کر لیا ہوگا۔ (۲) یا بعد میں۔

اگر قبل ہو، تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں:

الف: یہ رجوع قاضی کے فیصلہ کے بعد ہوگا۔

ب: یا پہلے ہوگا۔

ان تمام صورتوں میں بالاتفاق ملزم پر حد جاری نہیں ہوگی، خواہ حد رجم ہو یا جلد (کوڑے لگانا) ہو۔

اور رجوع کرنے والوں کی سزا کے بارے میں درج ذیل تفصیل ہے:

۱..... اگر اجرائے حد سے پہلے کسی گواہ نے یا سب گواہوں نے اپنی شہادت سے رجوع کیا، تو سب گواہوں پر حد قذف لگے گی، یعنی جن گواہوں نے رجوع نہیں کیا ان کو بھی حد قذف لگے گی۔ شیخینؒ (امام ابو حنیفہؒ و ابو یوسفؒ) کے نزدیک خواہ یہ رجوع قاضی کے فیصلے سے قبل ہو، یا بعد میں ہو، البتہ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ قضائے قاضی کے بعد جس جس گواہ نے رجوع کیا، تو صرف اسی پر حد قذف لگے گی، دوسروں

عبارات

فى الدر المختار: ويحد من رجوع من الاربعة بعد الرجم فقط لانقلاب شهادته بالرجوع قذفا وغرم ريع الدية وان رجع قبله، اى الرجم حد واللقذف ولا رجم لان الامضاء من القضاء فى باب الحدود.

وفى الشامية: قوله (فقط) قيد لقوله: ويحد من رجوع اى يحد الراجع فقط حد القذف. دون الباقيين لبقاء شهادتهم، قوله (وغرم ريع الدية) لان التالف بشهادته ريع الحق وكذا لو رجع الكل حدوا وغرموا الدية نهر، قوله: (وان رجع قبله) اى الرجم سواء كان قبل القضاء او بعده نهر، قوله (حدوا) اى حد الشهود كلهم، اما اذا كان قبل القضاء قول علماء نا الثلاثة. لانهم صاروا قذفة كـ، اما بعده فهو قولهما، وقال محمد: يحد الراجع فقط، لان الشهادة تأكدت بالقضاء فلا تنفسخ الا فى حق الراجع ولهما ان الامضاء من القضاء، ولذا سقط الحد عن المشهود عليه نهر (٢٣/٦)

كذا فى الهداية مع الفتح (٢٨/٥)

وفى المغنى لابن قدامة: وان رجعوا عن الشهادة او واحد منهم فعلى جميعهم الحد فى اصح الروايتين، وهو قول ابي حنيفة... وقال الشافعى: يحد الراجع دون الثلاثة لانه مقرر على نفسه بالكذب فى قذفه، واما الثلاثة فقد وجب الحد بشهادتهم وانما سقط بعد وجوبه بارجوع الراجع، ومن وجب الحد بشهادته لم يكن قاذفا فلم يحد كما لو لم

يرجع، ولنا انه نقص العدد بالرجوع قبل اقامة الحد فلزمهم الحد كما لو شهد ثلثة وامتنع الرابع من الشهادة الخ (٣٦٩/١٢)

وفى الهداية مع الفتح: وان شهد اربعة على رجل بالزنا فضرب بشهادتهم ثم وجد احدهم عبدا او محدودا فى قذف فانهم يحدون لانهم قذفة، اذا لشهود ثلاثة، وليس عليهم ولا على بيت المال ارش الضرب... وهذا عند ابي حنيفة، وقالوا: ارش الضرب ايضا على بيت المال، قال العبد الضعيف عصمه الله: معناه اذا جرحه وعلى هذا الخلاف اذا مات من الضرب وعلى هذا اذا رجع الشهود لا يضمنون عنده وعندهما يضمنون الخ (٢٦/٥)

كذا فى مجمع الضمانات (ص ٢٠١)

وفى الفقه الإسلامى وادلته: وقال الشافعية والحنابلة وبعض المالكية: اذا رجع الشهود وقد نفذ القصاص او قتل الردة او رجم الزنا او الجلد او القطع ومات المجلود او المقطوع، وقال الشهود: تعمدنا الشهادة، فيقتص منهم او يلزمون بدية مغلظة فى مالهم موزعة على عدد رؤسهم لتسببهم فى اهلاك المشهود عليه الخ (٥٤٤/٢)

وفى نهاية المحتاج: وخرج "بتعمدنا" اخطانا فعليهم دية مخففة فى ماله لا على عاقلة (٣١١/٨)

وفيه: اذا رجعوا عن الشهادة قبل الحكم امتنع او بعده وقبل استيفاء مال استوفى او عقوبة لادعى كقصاص وحد قذف او لله تعالى كزنا وسرقة، فلا يستوفى لانها تسقط بالشبهة الخ (٣١٠/٨)

کیا گواہ غیر مسلم ہو سکتا ہے؟

س۔ کیا گواہ غیر مسلم ہو سکتا ہے؟ (اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامداً ومصلحاً:

گواہی کا مسئلہ قضاء کے مسئلہ کی طرح ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک کافر بالکل گواہ نہیں بن سکتا، یعنی نہ کسی مسلمان کے حق میں، اور نہ کسی کافر کے حق میں، جب کہ حنفیہ کے ہاں کافر کسی مسلمان کے حق میں گواہ نہیں بن سکتا، البتہ کافر کافر کے حق میں گواہ بن سکتا ہے (ملاحظہ ہوں فقہی عبارات)۔

فی المغنی: من لم یکن من الرجال والنساء عاقلاً مسلماً بالغاً عدلاً لم تجز شہادۃ، وجملتہ: انہ یعتبر فی الشاہد ستۃ شروط احدها ان یكون عاقلاً الثانی: ان یكون مسلماً (الی ان قال): وممن قال: لا تقبل شہادۃم الحسن وابن ابی لیلی والا وزاعی ومالک والشافعی وابو ثور وذہب طائفۃ من اهل العلم الی ان شہادۃ بعضهم علی بعض تقبل الخ (۱۷۳/۱۴)

وفی حاشیۃ الدسوقی: وانما تصح شہادۃ العدل وبینہ بقولہ: العدل ای حقیقۃ فی عرف الفقہاء حر مسلم لا کافر ولو علی مثله الخ (۱۶۴/۴)

فی زاد المحتاج: شرط الشاہد مسلم حر مکلف عدل فلا تقبل شہادۃ الکافر علی مسلم ولا علی کافر خلافاً لابی حنیفۃ فی قبول شہادۃ الکافر علی الکافر الخ (۵۷۵/۴) وفی الدر المختار: تقبل من اهل الاهواء، ومن الذمی لو

عدلاً فی دینہم جوہرہ، علی مثله وان اختلفا ملۃ الخ (۱۶۷/۸)

فی المبسوط للسرخسی: ورجم رسول اللہ ﷺ یہودیین دینا بشہادۃ اربعۃ منهم وعن ابی موسیٰ ان النبی ﷺ اجاز شہادۃ النصاری بعضهم علی بعض والسلف رحمہم اللہ کانو مجسعين علی هذا (۱۶۷ ۱۳۵)

☆☆☆

کیا قاضی کیلئے مسلمان ہونا شرط ہے؟

س۔ کیا قاضی کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے؟ (اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامداً ومصلیاً

مسلمان کے حق میں قاضی کا مسلمان ہونا باتفاق ائمہ اربعہ ضروری ہے، خواہ مقدمہ حدود کا ہو، یا کسی اور باب سے متعلق ہو، البتہ غیر مسلم غیر مسلموں کے حق میں قاضی بن سکتا ہے یا نہیں؟ تو ائمہ ثلاثہ کے ہاں غیر مسلم غیر مسلموں کے حق میں بھی قاضی نہیں بن سکتا، اور حنفیہ کے ہاں بن سکتا ہے۔ (ملاحظہ ہوں فقہی عبارات)۔

فی الأحکام السلطانیة للإمام الماوردی: فلا يجوز تقليد القضاء إلا لمن كملت فيه سبع شرائط: الذكورية، والبلوغ، والعقل، والحرية، والإسلام والعدالة، والسلامة في السمع والبصر والعلم..... وأما الإسلام فلا أن الفاسق المسلم لا يجوز أن يلي فأولى أن لا يلي الكافر.

وفي حاشية الأحكام السلطانية: قال الله تعالى: ﴿وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا﴾ قال الماوردي: ولا يجوز تقليد الكافر القضاء على الكافرين، وقال ابو حنيفة: يجوز تقليده القضاء بين أهل دينه الخ (۲/۶۰).

وفي كتاب ادب القضاء للقاضي شهاب الدين الشافعي المعروف بابن ابي الدم المتوفى ۶۳۲ هج: شرائط القضاء عشرة: الإسلام والحرية والذكورة والتكليف..... واحترزنا بالإسلام والحرية والذكورة والتكليف عن الكافر

والعبد والمرأة والصبي، فهؤلاء ليسوا من أهل القضاء، وإن ولوا لم تنعقد ولا يتهم ولا احكام (ص ۲۷۱).

وفي زاد المحتاج: وشرط القاضي مسلم مكلف حر الخ (۵۱۲/۳)

وفي تبصرة الحكام لابن فرحون المالكي: وشروط القضاء التي لا يتم القضاء الا بها ولا تعقد الولاية ولا يستند عقد لها الا معها عشرة: الاسلام فلا تصح من الكافر اتفاقاً (۱۸۰/۱)

وفي حاشية الدسوقي: اهل القضاء عدل العدالة تستلزم الاسلام والبلوغ الخ (۱۲۹/۳)

وفي المغنى: ولا يولى قاض حتى يكون بالغاً عاقلاً مسلماً حر الخ (۱۲/۱۳)

في الدر المختار: واهله اهل الشهادة اى ادائها على المسلمين كذافي الحواشي السعدية.

وفي الشامية: وحاصله: ان شروط الشهادة من الاسلام والعقل شروط لصحة توليته.

وفي الدر المختار: ان الكافر يجوز تقليده ليحكم بين اهل الذمة ذكره الزيلعي في التحكيم، الخ (۲۴/۸)

بدکاری کے نتیجے میں اگر عورت کا حمل ظاہر ہو جائے
لیکن کوئی گواہ نہ ہو، تو کیا عورت کو سزا دی جائیگی؟

س۔ بدکاری کے نتیجے میں اگر عورت کا حمل ظاہر ہو جائے لیکن کوئی گواہ نہ ہو، تو کیا عورت کو سزا دی جائیگی؟ (اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامداً ومصلیاً

اس سلسلہ میں ائمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ حد نہ صرف دو طریقوں سے ثابت ہو سکتی ہے: اقرار یا شرعی شہادت۔

عورت کا حمل اگر ظاہر ہو جائے، تو محض حمل کا ظہور ثبوت حد زنا کے لئے کافی نہیں۔ جبکہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ اگر عورت غیر منکوحہ ہو، اور باندی بھی نہ ہو، یا منکوحہ ہو، لیکن شوہر اس کا محبوب ہو، یا بچہ ہو، یا شوہر کے دخول سے چھ ماہ کم کے عرصہ میں اس کا مکمل بچہ پیدا ہوا، اور اگر اس کی کوئی علامت اس سے ظاہر نہ ہو رہی ہو، تو ان تمام صورتوں میں عورت کا زنا محض حمل سے ثابت ہو جائے گا، اور اس پر حد جاری ہوگی۔ (ملاحظہ ہوں فقہی عبارات)

قال عمر بن الخطاب وهو جالس على منبر رسول ﷺ: ان الله قد بعث محمداً ﷺ... وان الرجم في كتاب الله حق على من زنى اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البينة او كان الحبل او الاعتراف (مسلم شريف كتاب الحدود).

وفي التكملة: وبه استدلل مالک رحمہ اللہ تعالیٰ علی:

الزنا يثبت بظهور حمل غير متزوجة بمن يلحق به الولد بان لا تكون متزوجة او متزوجة بصى او محبوب او انت به كاملاً لدون ستة اشهر من دخول زوجها... وقال ابو حنيفة والشافعي واحمد رحمهم الله تعالى: لا تحد بمجرد ظهور الحمل حتى تعترف بالزنا او يشهد اربعة اشهود (۴۳۳/۲) وفي الشرح الصغير للدردير: وثبت الزنا باقراره... وبالبينة... او بحمل اى وثبت ايضا بظهور حمل غير متزوجة بمن يلحق به الولد ان لا تكون متزوجة اصلاً، او متزوجة بصى او محبوب او انت به كاملاً لدون ستة اشهر من دخول زوجها (۴۵۴/۳)

وفي المغنى لابن قدامة: فصل: وإذا حبلت امرأة لا زوج لها، ولا سيد، لم يلزمها الحد بذلك، وتسال / فإن ادعت أنها أكرمت، أو وطئت بشبهة، أو لم تعترف بالزنى، لم تحد وهذا قول أبي حنيفة، والشافعي. وقال مالک: عليها الحد إذا كانت مقيمة غير غريبة، إلا أن تظهر أمارات الإكراه، بأن تأتي مستغيثة أو صارخة؛ لقول عمر، رضی اللہ عنہ: والرجم واجب على كل من زنى من الرجال والنساء إذا كان محصناً، إذا قامت بينة، أو كان الحبل أو الاعتراف وروى أن عثمان أتى بامرأة ولدت لستة أشهر، فأمر بها عثمان أن ترجم، فقال علي: ليس لك عليها سبيل، قال الله تعالى: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾: وهذا يدل على أنه كان يرجمها بحملها، ومن عمر نحو

من هذا. وروى عن علي، رضي الله عنه. أنه قال: يا أيها الناس، إن الزنى زنا، إن زنا سرٍّ وزنى علانية، فزنى السرٍّ أن يشهد الشهود، فيكون الشهود أول من يرمى، وزنى العلانية أن يظهر الحبل أو الاعتراف، فيكون الإمام أول من يرمى وهذا قول سادة الصحابة، ولم يظهر لهم في عصرهم مخالف، فيكون إجماعاً. ولنا، أنه يحتمل أنه من وطء إكراه أو شبهة، والحد يسقط بالشبهات. وقد قيل: إن المرأة تحمّل من غير وطء بأن يدخل ماء الرجل في فرجها، إمّا بفعلها أو فعل غيرها. ولهذا تصور حمل البكر، فقد وجد ذلك. وأما قول الصحابة، فقد اختلفت الرواية عنهم، فروى سعيد، حدثنا خلف بن خليفة، حدثنا أبو هاشم، أن امرأة، رفعت إلى عمر بن الخطاب، ليس لها زوج، وقد حملت، فسألها عمر، فقالت: إني امرأة ثقيلة الرأس، وقع على رجل وأنا نائمة، فما استيقظت حتى فرغ. فدرأ عنها الحد وروى النزال بن سبرة، عن عمر، أنه أتى بامرأة حامل، فادّعت أنها أكرهت، فقال: خلّ سبيلها. وكتب إلى أمراء الأجناد، أن لا يقتل أحد إلا بإذنه. وروى عن علي، وابن عباس، أنهما قالا: إذا كان في الحد لعل وغسي، فهو مُعْطَل. وروى الدار قطنى بإسناده عن عبد الله بن مسعود، ومعاذ بن جبل، وعقبة بن عامر، أنهم قالوا: إذا اشتبه عليك الحد، فادرأ ما استطعت. ولا خلاف في أن الحد يُدرأ بالشبهات، وهي متحققة ههنا.

وفي التشريع الحناني: القرائن. القرينة المعتبرة في الزنا هي ظهور الحمل في امرأة غير متزوجة أولاً يعرق لها زوج ويلحق بغير المتزوجة من تزوجت بتسبي لم يبلغ الحلم أو بمحبوب ومن تزوجت بالغاً فولدت لأقل من ستة أشهر والأصل، في اعتبار قرينة الحمل دليلاً على الزنا قول أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وفعلهم: فعمر رضي الله عنه يقول الرجم واجب على كل من زنا من الرجال والنساء إذا كان محصناً إذا أقامت بينة أو كان الحبل أو الاعتراف وروى عن عثمان رضي الله عنه أنه أتى بامرأة ولدت لستة أشهر كاملة فرأى عثمان أن ترجم فقال علي ليس لك عليها سبيل قال الله تعالى «وحمله وفصاله ثلاثون شهراً». وروى عن علي رضي الله عنه أنه قال: يا أيها الناس إن الزنا زنيان زنا سرٍّ وزنا علانية فزنا السر أن يشهد الشهود فيكون الشهود أول من يرمى وزنا العلانية أن يظهر الحبل والاعتراف، هذا هو قول الصحابة ولم يظهر لهم مخالف في عصرهم فيكون إجماعاً.

والحمل ليس قرينة قاطعة على الزنا بل هو قرينة تقبل الدليل العكسي فيجوز إثبات أن الحمل حدث من غير زنا ويجب درء الحد عن الحامل كلما قامت شبهة في حصول الزنا أو حصوله طوعاً فإذا كان هناك مثلاً احتمال بأن الحمل كان نتيجة وطء بإكراه أو بخطأ وجب درء الحد وإذا كان هناك احتمال بأن الحمل حدث بدون إيلاج

لبقاء البکارة امتنع الحد إذ قد تحمل المرأة من غیر ایلاج
 بأن یدخل ماء الرجل فی فرجها إما بفعلها أو بفعل غیرها أو
 نتیجة وطء خارج الفرج ویری أبو حنیفة والشافعی
 واحمد أنه إذا لم یکن دلیل علی الزنا غیر الحمل فادعت
 المرأة أنها اکرھت أو وطئت بشبهة فلا حد علیها فإذا لم
 تدع إکرامها ولا وطأً بشبهة فلا حد علیها أيضاً ما لم تعترف
 بالزنا لأن الحد أصلاً لا یجب إلا بینة أو بإقرار (۱)
 (۴۴۰/۲)



زنا بالجبر حرامہ میں شامل ہے یا حد میں؟ اگر حرامہ میں
 شامل ہو تو کیا اس کی سزا موت ہو سکتی ہے؟

س۔ زنا بالجبر حرام میں شامل ہے یا حد میں؟ اگر حرامہ میں شامل ہو تو کیا اس کی سزا موت ہو سکتی ہے؟ (اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامداً ومصلحاً:

زنا بالجبر جرم زنا کا ایک فرد ہے، جبکہ حرامہ اس سے مختلف جرم ہے، لہذا زنا بالجبر کی صورت میں حد زنا ہی جاری ہوگی، نہ کہ حد حرامہ، فقہاء کرام نے زنا کی جو تعریف کی ہے وہ حرامہ پر صادق نہیں آتی، اور حرامہ کی جو تعریف کی ہے وہ زنا پر صادق نہیں آتی۔ (ملاحظہ: تول فقہی عبارات)

فی التشريع الجنائي : الحراة هي قطع الطريق أو هي السرقة الكبرى (۶۳۸/۲)۔

وفی تکملة فتح الملهم: الحراة هي قطع الطريق وهو الخروج لأخذ المال على سبيل المغالبة على وجه يمتنع المارة عن المرور وينقطع الطريق (۳۰۸/۲)۔

وفی المغنی لابن قدامة: والمحاربون الذين يعرضون للقوم بالسلاح فی الصحراء فيغصبونهم المال مجاهرة (۴۷۴/۱۲)۔

وفی الشرح الصغير: المحارب الذي يترتب عليه أحكام الحراة قاطع الطريق أي مخيفها لمنع سلوك أي مرور فيها أو أخذ مال محترم على وجه يتعذر منه الغوث (۴۹۱/۴)۔

وفی تحفة المحتاج مع حواشی الشروانی۔ باب قاطع الطريق سمي بذلك لمنعه المرور فيها ببروزہ لأخذ مال أو قتل أو إرهاب مكابرة اعتماداً على القوة مع عدم الغوث، والأصل فيه قوله تعالى: ﴿إنما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله﴾ الآية (۱۵۷/۹)۔



رجم کی سزا کا حکم سورہ نور کے نزول سے پہلے ہے یا
بعد میں؟

س۔ سزا کے رجم کا حکم سورۃ نور کے نزول سے پہلے ہے یا بعد میں؟ (اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامداً ومصلحاً:

تحقیق کے مطابق دلائل کی روشنی میں رائج یہی ہے کہ سورۃ نور رجم کے واقعات سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ سورۃ نور سن پانچ ہجری یا زیادہ سے زیادہ سن چھ ہجری میں نازل ہوئی ہے، جبکہ رجم کے سارے واقعات سن چھ ہجری کے بعد پیش آئے ہیں، جس کی تائید بہت سے دلائل سے ہو رہی ہے۔ (ملاحظہ ہو عبارت)

فی تکملة فتح الملهم: فالراجح اذن ان سورة النور نزلت في السنة الخامسة من الهجرة وغاية ما في الباب ان تكون نزلت في السنة السادسة وان واقعات الرجم كلها وقعت بعد هذه السنة وتدل على ذلك دلائل كثيرة:

۱- ان أول واقعات الرجم واقعة اليهوديين، لما أخرجه عبد الرزاق في مصنفه ۴: ۳۱۶ رقم ۳۳۳۰ عن أبي هريرة، قال: "أول مرجوم رجمه رسول الله ﷺ من اليهود" ولما سيأتي عند المصنف أن النبي ﷺ قال بعد رجم اليهوديين: "اللهم إني أول من أحيا أمرك إذ أمتوتوه"، ولما أخرجه أحمد في مسنده ۱۵: ۲۶۱ عن ابن عباس أنه قال بعد حكاية قصة اليهوديين: "فكان مما صنع الله عز وجل لرسوله في تحقيق الزنا منهما".

وقد ذكر صاحب السيرة الحلبية ۲: ۳۳۳ أن رجم اليهود وقع في السنة الرابعة، ولكنه لم يأت على ذلك بدليل، وحقق الحافظ في الفتح ۱۲: ۱۵۲ (باب أحكام أهل الذمة) أنه إنما وقع بعد فتح مكة في السنة الثامنة، واستدل على ذلك بأنه شهده عبد الله بن الحارث ابن الجزء رضي الله عنه، لأنه يقول بعد حكاية قصة اليهوديين: "فكنت فيمن رجمهما" رواه البزار والطبراني، كما في مجمع الزوائد ۶: ۲۷۱، وأن عبد الله بن الحارث إنما قدم المدينة مسلماً مع والده بعد فتح مكة.

قال العبد الضعيف عفا الله عنه: ويؤيده أيضاً أن أبا هريرة كان مع النبي ﷺ حين أتاه اليهود في هذه القضية، لما أخرجه ابن جرير في تفسير سورة المائدة ۲: ۳۵ عنه، قال "كنت جالسا عند رسول الله ﷺ إذ جاء رجل من اليهود الخ" وثابت أن أبا هريرة إنما أسلم في السنة السابعة، فلا جرم أن رجم اليهود إنما وقع بعد السنة السابعة.

ويؤيده أيضاً أن الزائين كانا من أهل فدك، وإن أهل خيبر هم الذين بعثوا بهذه القضية إلى رسول الله ﷺ كما تقدم في رواية مسند الحميدي، فالظاهر أنهم فعلوا ذلك بعدما جاء ت خيبر تحت حكمه ﷺ في السنة السابعة، وما ذكره الحافظ في الفتح ۱۲: ۱۶۷ عن ابن العربي عن الطبري: "وكانت خيبر حينئذ حرباً" لم أجده في تفسير

الطبرى، وذكره وجدت له سنداً يعتمد عليه، وإنما ذكره بعض المفسرون بدون إسناد، ويعارضه ما ذكره البخارى أنهم كانوا أهل ذمة، ذكره العيني فى باب الرجم فى البلاط من عمدة القارى ١١: ١٥٣ عن ابن الطلاع.

ثم قد أسلفنا عن الحميدى فى مسنده ٢: ٥٢١ أن الذين بعثوا بهذه القضية إلى إخوانهم من أهل المدينة قالوا لهم: "فإن أمركم بالجلد فخذوه عنه، وإن أمركم بالرجم فلا تأخذوه عنه" وهو يدل على أن عقوبة الزانى فى الإسلام بالجلد كانت قد اشتهرت حينئذ. وإن عقوبة الجلد إنما عرفت بسورة النور، لأن عقوبة الزانى قبل ذلك كانت حبساً، كما هو مذكور فى سورة النساء. فالظاهر أن هذه الواقعة كانت بعد نزول سورة النور.

وأخيراً، وليس آخراً، إن آيات سورة المائدة التى ذكرناها فى أول هذا المبحث قد نزلت فى قصة اليهوديين، وإن سورة المائدة من آخر القرآن تنزيلاً، لما رواه السيوطى فى الدر المنثور ٢: ٢٥٢ عن حمزة بن حبيب، وعطية بن قيس أن النبى ﷺ قال: "المائدة من آخر القرآن تنزيلاً، فأحلوا حلالها، وحرموا حرامها" وقد ذكر المفسرون أن المائدة نزلت بعضها فى الحديبية، وبعضها فى فتح مكة، وبعضها فى حجة الوداع. كما فى تفسير القرطبى ٦: ٣٠ ويظهر منه أن أقدم ما نزل من المائدة لا يتقدم على الحديبية، وإنها وقعت فى السنة السادسة. فغاية ما فى

الباب أن تكون هذه الآيات نزلت بعد الحديبية، ولما كانت غزوة بنى المصطلق متقدمة عليها، فإن سورة النور نزلت قبلها.

واعترض بعض الناس على ذلك بأن قصة اليهود تدل على أن اليهود كانوا مقيمين إذ ذاك بالمدينة، وقد وقع إجلاء بنى النضير فى السنة الثانية، وقتل بنى قريظة فى السنة الخامسة، فلتكن قصة زنا اليهوديين قبل الخامسة، وقبل سورة النور.

ولكن هذا الاستدلال غير مستقيم، أما أولاً فالأمر غايه ما يثبت منه أن قصة زنا اليهوديين وقعت بعد قتل بنى قريظة، ولكنه لا يدل على كونها قبل سورة النور، لأن قتل بنى قريظة وقع بعد وقعة الأحزاب متصلاً، وقدمنا عن موسى بن عقبة أن غزوة بنى المصطلق التى نزلت فيها سورة النور وقعت قبل غزوة الأحزاب.

وأما ثانياً، فلأن اليهود لم يستأصلوا بعد قتل بنى قريظة من شأنهم، وإنما بقى منهم بالمدينة بقايا، ويدل على ذلك ما أخرجه البخارى وغيره أن درع النبى ﷺ كان مرهوناً عند رجل من اليهود عند وفاته ﷺ.

ويقول السهمودى فى وفاء الرفاء ١: ٣٠٩: "إن إجلاء من بقى من طوائف اليهود بالمدينة كان بعد قتل قريظة" ثم ذكر بعد ذلك أن الطوائف الباقية من اليهود إنما أخرجوا من المدينة بعد السنة السابعة من الهجرة، ولم يزل بيت

المدارس باقيا إلى السنة. ثم ذكر في موضع آخر من وفاء الوفاء ١ : ١٦٣ أن يهودا من بنى ناغصة لم يزالوا مقيمين في شعب بنى حرام، حتى نقلهم سيدنا عمر رضى الله عنه إلى قريب من مسجد الفتح.

فلما ثبت أن رجم اليهوديين أول ما وقع من واقعات الرجم، وأنه وقع بعد السنة السابعة فسائر واقعات الرجم متأخرة عن آية سورة النور، فلا يمكن نسخها بسورة النور.

٢- وأما واقعة رجم ماعز رضى الله عنه فلم يثبت لى تاريخها فى شىء من الروايات الصحيحة. غير أنه أخرج الحاكم فى مستدركه ٣ : ٣٦١ عن ابن عباس فى قصة ماعز: "ثم قال رسول الله ﷺ لمن كان معه: أبصاحبكم مس؟ قال ابن عباس: فنظرت إلى القوم لأشير عليهم، فلم يلتفت إلى منهم أحد... الخ" مما يدل على أن ابن عباس رضى الله عنه كان حاضرا حين جاء ماعز رضى الله عنه إلى النبى ﷺ، وإن ابن عباس إنما جاء المدينة مع أمه فى السنة التاسعة، كما صرح به الحافظ فى الفتح ١٢ : ١٠٦، فيظهر منه أن قصة ماعز كانت فى السنة التاسعة أو بعدها، ولكن رواية الحاكم هذه مروية عن حفص بن عمر العدلى، وقد ضعفه أكثر المحدثين، ورموه بالأوهام فى الأسانيد، والاختلاط فى الأسماء، كما فى التهذيب ٢ : ٢١٠، ومن ثم تعقب الذهبى تصحيح الحاكم لهذا الحديث، فلا يوثق بهذه الرواية.

ولكن رحم اليهوديين كان قبل قصة ماعز رضى الله عنه كما أسلفنا، فلا جرم أنها وقعت بعد السنة السابعة، وبعد نزول سورة النور.

٣- وأما رجم الغامدية فقد ثبت بعدة روايات صحيحة أنه وقع بعد نزول سورة النور، لأنه سيأتى عند المصنف فى هذا الباب فى حديث بريدة رضى الله عنه أن خالد بن الوليد رضى الله عنه رماها بحجر، وإن خالد بن الوليد رضى الله عنه إنما جاء إلى المدينة مسلما فى السنة الثامنة من الهجرة، كما يقول هو بنفسه فى قصة إسلامه: "قدمنا المدينة على رسول الله ﷺ أول يوم من صفر سنة ثمان" راجع طبقات ابن سعد ٣ : ٢٥٢.

وما قاله بعض المؤرخين أنه أسلم يوم الحديبية فى السنة الخامسة فهو وهم، صرح به الحافظ فى الإصابة ١ : ٢١٣ وابن الأثير فى أسد الغابة ٢ : ٩٣، ولعل منشأ الوهم أنه رضى الله عنه وقع فى قلبه الإسلام عند الحديبية، ولكنه لم يتفق له الإسلام إلا فى السنة الثامنة، كما حكى هو بنفسه فى قصة إسلامه، راجع لها البداية والنهاية ٢ : ٢٣٨ إلى ٢٤٠ فى واقعات السنة الثامنة. فلعل ذكره الجنوح إلى الإسلام لبس على بعض الرواة تاريخ إسلامه.

ثم لو سلم إسلامه بعد الحديبية على سبيل الفرض، فإنه يثبت به على الأقل أن قصة الغامدية وقعت بعد الحديبية، وقدمنا أن سورة النور نزلت فى غزوة بنى المصطلق،

وكانت قبل الحديدية بكثير.

ومن هنا صرح غير واحد من المحدثين أن قصة الغامدية وقعت في السنة التاسعة، راجع السيرة الحلبية ٣ : ٥٠٢ وأوجز المسالك ٦ : ١٣ باب ما جاء في الرجم.

٣- وأما قصة العسيف فقد ثبت بعدة دلائل أنها كانت بعد نزول سورة النور:

أما أولا فلأن أباه قال للنبي ﷺ : "إن ابني هذا كان عسيفا على هذا، فزني بامرأته، فافتديت منه بمائة شاة وخادم، ثم سألت رجلا من أهل العلم، فأخبروني أن على ابني جلد مائة وتغريب عام" مما يدل على أن عقوبة مائة جلدة للزاني كانت مشروعة حينئذ، ولم تشرع هذه العقوبة إلا بنزول آية الجلدة في سورة النور، وكانت عقوبة الزنا قبل ذلك الحبس في البيوت، وقد صرح بذلك ابن عباس حيث قال: "كن يحبس في البيوت، فإذا ماتت ماتت، وإن عاشت عاشت، حتى نزلت هذه الآية في النور الزانية والزاني الخ" أخرجه الطبراني، كما في مجمع الزوائد ٦ : ٢٦٣، فقول أهل العلم هذا من أثبت الشهادات الداخلية على أن هذه القصة كانت بعد سورة النور.

وأما ثانيا، فإن قصة العسيف شهد بها أبوهريرة رضي الله عنه، حيث قال : "كنا عند النبي ﷺ فقام رجل" أخرجه البخاري في باب الاعتراف بالزنا. وإن أبا هريرة إنما أسلم في السنة السابعة فثبت، والحمد لله تعالى، أن واقعات

الرجم كلها وقعت بعد نزول سورة النور. ثم إن حكم رجم الزاني الثيب لم يثبت بهذه الواقعات فقط، وإنما ثبت بأحاديث قولية كثيرة، مثل حديث عبادة بن الصامت رضي الله عنه، الذي مر في الباب السابق، وإنه ورد بعد نزول آية النور قطعا، لأنه أول حديث ذكر حكم الزاني بعدما كان عقوبته الحبس، وإنه مشتمل على عقوبة مائة جلدة، التي لم تثبت إلا بسورة النور.

وكذلك قوله عليه السلام: "الولد للفراش، وللعاهر الحجر" قد تكلم به النبي ﷺ في خطبة حجة الوداع بعد نزول سورة النور بكثير، وقد ذكرنا أنه حديث متواتر.

ثم لم يزل الخلفاء الراشدون، وجميع الصحابة رضوان الله عليهم أجمعين، يعتقدون الرجم كحكم شرعي محكم، ولم يرد عن أحد منهم القول بنسخه، فالقول بنسخ حكم الرجم قول باطل لا دليل عليه.



تغزیر کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟

غير جنس الحد کا لجس تعلق باجتہاد الامام ان رأى
الجلد فيجب ان ينقص عن الحد (۱۷۴/۱۰)
وفي المغنى: فليس اقله مقدر الا انه لو تقدر لكان حدا ولان
النبي ﷺ قدر اكثره ولم يقدر اقله فيرجع فيه الى اجتہاد
الامام فيما يراه وما يقتضيه حال الشخص الخ (۵۲۵/۱۲)



س۔ تعزیر کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟ (اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامدا ومصليا:

ائمہ ثلاثہ کی عبارات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں تعزیر کی کم
از کم مقدار قاضی کی صوابدید پر ہے، البتہ حنفیہ کے ہاں اس میں مندرجہ ذیل اقوال
ہیں:

الف: تعزیر کی کم سے کم مقدار تین کوڑے ہیں۔

ب: کم از کم مقدار قاضی کی صوابدید پر ہے۔

ج: جرم کی نوعیت کو دیکھا جائیگا، اور اس کے مطابق قاضی تعزیر کی مقدار
متعین کریگا۔

د: تعزیری جرم کا تعلق جس باب سے ہو، تعزیر کی کم از کم مقدار اس باب
کی حد کے قریب قریب ہوگی۔ مثلاً اگر کسی نے کسی اجنبیہ کو چومایا اسکو چھوا، تو اس کی
تعزیر حد زنا کے قریب ہوگی۔ (ملاحظہ ہوں فقہی عبارات)

فی الهدایة مع الفتح: واقله ثلاث جلدات وذكر مشائخنا:

ان ادناه على ما راه الامام فيقدر بقدر ما يعلم انه ينزجر لانه

يختلف باختلاف الناس وعن ابى يوسف: انه على قدر عظم

الجرم وصغره، وعنه: انه يقرب كل نوع من بابه، فيقرب

المس والقبلة من حدا الزنا والقذف بغير الزنا من حد

القذف (۱۱۶/۵)

وفي روضة الطالبين للنووي: واما قدر التعزير فان كان من

احسان کی تعریف کیا ہے؟ نیز اگر بیوی کتابیہ ہو تو
کیا اس کا مسلم شوہر محسن سمجھا جائیگا؟

س: احسان کی تعریف کیا ہے؟ نیز اگر بیوی کتابیہ ہو تو کیا ای کا مسلم شوہر محسن سمجھا جائے گا؟ (اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامداً ومصلیاً

حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک احسان ثابت ہونے کے لئے ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے: آزاد ہو، عاقل ہو، بالغ ہو، مسلمان ہو، اور نکاح صحیح کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کے ساتھ کم از کم ایک بار جماع کر چکا ہو۔

شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں بھی احسان کے لئے یہی شرائط ضروری ہیں، البتہ ان کے ہاں اسلام شرط نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر شوہر مسلمان ہو، اور اس کی بیوی کتابیہ ہو، اور وہ نکاح صحیح کے ساتھ اس کتابیہ کے ساتھ جماع بھی کر چکا ہو، تو کیا اس صورت میں یہ شوہر شرعاً محسن سمجھا جائے گا، جن حضرات کے نزدیک اسلام شرط نہیں، یعنی حنابلہ اور شافعیہ، ان کے نزدیک تو بات بالکل واضح ہے، کیونکہ ان کے ہاں تو اگر دونوں میاں بیوی مسلمان نہ ہوں تو بھی احسان ثابت ہوگا، حضرت امام مالکؒ کے نزدیک احسان کے لئے اسلام شرط ہے اور وہ شرط یہاں شوہر میں موجود ہے، اس لئے ان کے نزدیک بھی شوہر محسن ہو جائے گا، اور حنفیہ کے ہاں احسان کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو شرطیں احسان کے لئے ضروری ہیں، وہ میاں بیوی دونوں میں جماع کے وقت موجود ہوں، اور مذکورہ صورت میں چونکہ یہ شرط موجود نہیں، اس لئے کہ بیوی مسلمان نہیں، لہذا حنفیہ کے ہاں شوہر محسن نہیں ہوگا۔ (ملاحظہ ہوں فقہی عبارات)

فی الہدایۃ مع الفتح: واحسان الرجم ان یکون حراً عاقلاً بالغاً مسلماً قد تزوج امرأۃ نکاحاً صحیحاً ودخل بها علی صنفۃ الاحسان (۲۲/۵)۔

وفی الشرح الصغیر للدرر: وهو حر مسلم مکلف، ومتی اختل شرط لا یکون محصناً فلا یرحم (۳۵۵/۲)۔

فی معنی المحتاج: وحد المحصن الرجم، وهو مکلف حر لو ذمی فی عیب حشفۃ بقبل فی نکاح صحیح لا فاسد فی الاظهر (۱۳۶/۳)۔

وفی المعنی: ولا یشرط الاسلام فی الاحسان بهذا قال الزہری والشافعی۔ علی هذا یکون الذمیان محصنین، فان تزوج المسلم ذمیۃ فوطئها صار محصنین، عن احمد رواۃ اخرى فی الذمیۃ لا تحصن المسلم، وقال عطاء والنخعی والشعبی ومجاهد والثوری: هو شرط الاحسان فلا یکون الکافر محصناً، ولا تحصن الذمیۃ مسلماً، لان ابن عمر روی ان النبی ﷺ قال: من اشرك بالله فلیس بمحصن، ولانه احسان من شرطه الحرۃ فکان الاسلام شرطاً فیہ کاحسان القذف، وقال مالک کقولہم، الا ان الذمیۃ تحصن المسلم بناء علی اصلہ فی انہ لا یعتبر الکمال فی الزوجین، ولنا ما روی مالک عن نافع عن ابن عمر انہ قال: جاء الیہود الی رسول اللہ ﷺ فذکروا لہ ان رجلاً منهم وامرأۃ زنیاً وذكر الحدیث فامر بہما رسول اللہ ﷺ فرجما، متفق علیہ (۳۱۷/۲)۔

كذا في تكملة فتح الملهم (۲/۲۶۸)

وفي الهداية مع الفتح: وشرط صفة الاحصان فيهما عند الحصول حتى لو دخل بالمنكوحة او المملوكة او المجنونة او الصبية لا يكون محصا، وكذا اذا كان الزوج موصوفا باحدى هذه الصفات، وهي حرة مسلمة عاقلة بالغة، لان النعمة لا تتكامل، اذ الطبع ينفر عن صحبة المجنونة... ولا ائتلاف مع الاختلاف في الدين... وقوله عليه السلام: لا تحصن المسلم اليهودية ولا النصرانية، الحديث (۲۵/۵)

وفي المغنى لابن قدامة: الشرط الرابع ان يوجد الكمال فيهما جميعا حال الوطء فيطأ الرجل العاقل الحر امرأة عاقلة حرة، وهذا قول ابي حنيفة واصحابه، ونحوه قول عطاء والحسن وابن سيرين والنخعي وقتادة والثوري واسحاق الخ (۱۲/۳۱۷).

☆☆☆

حدود کے مسائل میں خواتین کی شہادت کی قبولیت
وعدم قبولیت کا کیا حکم ہے؟

س۔ حدود کے مسائل میں خواتین کی شہادت کی قبولیت و عدم قبولیت کا کیا حکم ہے؟
(اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

الجواب حامداً ومصلیاً:

حد زنا میں عورتوں کی شہادت سے متعلق آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ حدود میں خواتین کی شہادت جائز نہیں، چنانچہ امام ابن شہاب زہریؒ کی روایت ہے کہ:

مبضت السنة من رسول الله ﷺ والخليفين من بعده الا

تجوز شهادة النساء في الحدود (مصنف ابن شيبه

۵۳۳/۵)۔

”آنحضرت ﷺ کے زمانہ اور آپ کے بعد دونوں خلفاء کے زمانہ سے یہ سنت چلی آ رہی ہے کہ حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔“

یاد رکھنا چاہئے کہ صحابی یا تابعی جب ”سنت“ کا لفظ اطلاق کے ساتھ استعمال کریں۔ تو اس سے مراد آنحضرت ﷺ کی سنت ہوتی ہے، اور وہ حدیث حکما مرفوع سمجھی جاتی ہے، لہذا اس اصول کی بناء پر امام زہریؒ کا مذکورہ اثر بحکم حدیث مرفوع ہے، چنانچہ اعلیٰ السنن میں مذکور ہے:

”واعلم ان لفظ السنة يدخل في المرفوع عندهم، قال ابن

عبد البر في التقصي: ان الصحابي اذا اطلق اسم السنة

فالمراد به سنة النبي ﷺ (الی قوله) ولو قال مثل ذلك

تابعی۔ هذا حاله فهو ايضا مرفوع حكما الخ“۔

پھر اس مسئلہ میں صحابہ کرام اور کبار تابعین کا تعامل اور کثیر مستند آثار موجود ہیں، جن میں اس بات کی صراحت ہے کہ حدود میں خواتین کی شہادت جائز نہیں، چند آثار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

”اخرج عبد الرزاق في مصنفه اخبرنا الحسن بن عماره عن

الحکم بن عتیبة ان علی بن ابی طالب قال: لا تجوز شهادة

النساء في الحدود والنماء (نصب الراية ۷/۴)۔

”عن ابراهيم قال: لا تجوز شهادة النساء في الحدود (موطا

امام مالک ۲/۲۳۳)۔

”عن عامر قال: لا تجوز شهادة النساء في الحدود (مصنف

ابن شيبه ۵/۵۲۳)۔

”عن الشعبي قال: لا تجوز شهادة امرأة في حد (ايضا)۔

واخرج عن الشعبي والنخعي والحسن والضحاك قالوا:

لا تجوز شهادة النساء في الحدود (نصب الراية ۷/۴)۔

خلاصہ یہ کہ اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، امام زہریؒ، امام شعبیؒ، امام ابراہیم نخعیؒ، امام حسن بصریؒ، ضحاکؒ، اور حماد جیسے کبار تابعین کے آثار بھی متفق ہیں کہ حدود میں خواتین کی گواہی معتبر نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں جمہور امت کا موقف یہی ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی جائز نہیں، اور یہی چاروں ائمہ کرام کا بھی مسلک ہے، جیسا کہ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے فرمایا ہے:

”وجمهور العلماء على انه يشترط ان يكونوا رجلا احرارا

فلا تقبل شهادة النساء ولا العبيد وبه يقول مالک

والشافعي واصحاب الرأي الخ (المغنی مع الشرح الكبير

والله تعالى اعلم

۵/۲)۔

عدالت کی دی ہوئی سزا کو
معاف کرنے کی شرعی حیثیت

عدالتوں کی دی ہوئی سزاؤں کو معاف کرنے کی شرعی حیثیت

برادر گرامی و محترم جناب مفتی صاحب زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جیسا کہ فون پر عرض کیا، کونسل کا ۱۳۶واں اجلاس ان شاء اللہ ۲۱-۲۲ جنوری ۲۰۰۲ء کو انڈیا پریزیڈنٹ ہو گا۔ خیال یہ ہے کہ ۲۰ تاریخ کو (بروز اتوار) کمیٹی برائے اصلاح قیدیوں و جیل خانہ جات (Prisoner Committee) کا اجلاس منعقد کر لیا جائے۔ سید افضل حیدر صاحب اس کے کنوینر ہیں۔ جیل کے قواعد و قوانین اور عمومی احوال کی شرعی نقطہ نظر سے اصلاح کے علاوہ دو اہم اصولی امور پر کمیٹی نے کونسل کے غور کے لئے تجاویز مرتب کرنی ہیں:

۱..... شریعت اسلامی میں قید کی سزا کا جواز یا عدم جواز۔

۲..... عدالتوں کی طرف سے دی گئی سزاؤں کی کلی یا جزوی معافی (منجانب صدر پاکستان، صوبائی گورنر صاحبان اور جیل افسران از روئے جیل مینوکل) کی شرعی حیثیت۔

آپ کی خدمت میں خصوصی گزارش یہ ہے کہ ان دونوں مسائل پر اپنی رائے تحریراً کمیٹی کے استفادہ کے لئے ۱۰ جنوری تک ارسال فرمائیں تو بے حد ممنون ہوں گا تاکہ کمیٹی ۲۰ تاریخ کو منعقد ہونے والی اپنی میٹنگ میں اس سے استفادہ کر سکے۔ اپنی اس گزارش کا بھی اعادہ کرتا ہوں کہ آپ اتوار ۲۰

جنوری کو اس کمیٹی کی میٹنگ میں شریک ہونے کی بھی بھرپور کوشش فرمائیں۔
والسلام

نیاز کیش

ڈاکٹر شیر محمد زمان

(ایس ایم زمان)

نوٹ ریکارڈ دیکھنے پر معلوم ہوا ہے کہ مسئلہ مذکورہ نمبر پر مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب کی رائے آپچی ہے اس لئے اس مسئلہ پر تحریر کی زحمت نہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

اسلامی شریعت کی رو سے بنیادی طور پر سزاؤں کی تین قسمیں ہیں، (۱)۔ حدود، (۲)۔ قصاص، (۳)۔ تعزیرات

عدالت کی طرف سے دی ہوئی ان تینوں سزاؤں کو کم یا ختم کرنے کے سلسلہ میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ اگر اوپر کی عدالت (عدالت اپیل) نے کسی قانونی (شرعی) نکتہ کی بناء پر قرار دیا کہ نیچے کی عدالت کے فیصلے میں وہ شرائط پوری موجود نہیں ہیں، جو اس سزا کے اجراء کے لئے لازمی ہیں، اور اس بناء پر اوپر کی عدالت (عدالت اپیل) نے کسی حد یا قصاص کو ختم کر دیا، یا تعزیر میں کمی کر دی، تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، کیونکہ درحقیقت یہ سزا کی معافی نہیں، بلکہ عدم ثبوت کی بناء پر فیصلہ کی تبدیلی ہے۔

لیکن جہاں تک ان سزاؤں کی معافی کا معاملہ ہے، تو اس میں درج ذیل تفصیل ہے:

تعزیرات: تعزیر کی دو قسمیں ہیں:

۱..... تعزیر جو حق اللہ کی وجہ سے ہو، مثلاً کسی نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لیا، یا ایسی مجلس میں شرکت کی جو فسق و فجور پر مشتمل ہو، یا رمضان میں کسی شرعی عذر کے بغیر روزہ توڑا، یا جان بوجھ کر نماز ترک کر دی، وغیرہ۔

۲..... تعزیر جو حق العبد کی وجہ سے ہو، مثلاً کسی نے کسی مسلمان کو کافر کہا، یا جو شخص فاسق نہ ہو، اس کو فاسق کہا، یا اس کو خبیث کہا، یا فاجر کہا، وغیرہ۔

جو تعزیر حق اللہ کی وجہ سے ہو، حضرات حنفیہ، مالکیہ اور حنبلیہ کے نزدیک بعض صورتوں میں یہ تعزیر نافذ کرنا حاکم پر واجب ہوتا ہے، اور بعض صورتوں میں واجب نہیں ہوتا، یعنی اگر مجرم کے حالات یا علامات و قرائن سے حاکم کو یہ غالب گمان ہو کہ مجرم کی اصلاح نہیں ہوئی ہے، اور نہ ہی تعزیر کے بغیر اس کی اصلاح ہونے کی توقع ہے، تو اس صورت میں حاکم پر تعزیر نافذ کرنا واجب اور ضروری ہے، اور اگر مجرم کے حالات یا علامات و قرائن سے حاکم کو غالب گمان ہو کہ مجرم کی اصلاح ہو چکی ہے، یا تعزیر کے بغیر بھی اس کی اصلاح ہونے کی توقع ہے، تو اس صورت میں حاکم پر تعزیر نافذ کرنا واجب نہیں، اور اس کے لئے ترک جائز ہے، جبکہ حضرات شافعیہ کے ہاں حاکم پر حقوق اللہ کی وجہ سے تعزیر قائم کرنا کسی بھی صورت میں حتمی طور پر واجب نہیں، بلکہ اس کی صوابدید پر ہے، مناسب سمجھے تو تعزیر جاری کرے، اور مناسب سمجھے تو جاری نہ کرے۔

اور جو تعزیر حق العبد کی وجہ سے ہو، حضرات حنفیہ، مالکیہ اور حنبلیہ کے ہاں اس میں تعزیر معاف کرنے یا ساقط کرنے کا اختیار صرف اسی شخص کو ہے، جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، کسی حاکم وغیرہ کو یہ حق نہیں کہ وہ حق العبد سے متعلق تعزیر کو معاف یا ساقط کرے، جبکہ حضرات شافعیہ کے ہاں دونوں قول

ہیں، یعنی ایک قول وہی ہے، جو جمہور فقہاء کا ہے، اور وہ یہ کہ یہ تعزیر حاکم وغیرہ معاف یا ساقط نہیں کر سکتا، بلکہ یہ حق صرف متاثرہ بندہ کو ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ حق اللہ کی طرح حاکم یہ حق بھی معاف کر سکتا ہے، بعض اہل الترجیع علماء شافعیہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، اور بعض نے دوسرے قول کو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تعزیر کا تعلق اگر حق اللہ سے ہے، اور عدالت نے اس میں کوئی سزا جاری کی ہے، لیکن کسی مجرم کے خصوصی حالات یا علامات و قرائن سے یہ بات واضح ہو کہ مجرم کی اصلاح ہو گئی ہے، یا تعزیر کی سزا کے بغیر بھی اس کی اصلاح ہو جانے کا غالب گمان ہو تو اس صورت میں اس کی گنجائش ہے کہ عدالت کی دی ہوئی سزا کو کوئی ایسی عدالت یا کوئی ایسا منصب دار جزوی یا کلی طور پر معاف کر دے، جس کو ملکی قانون نے اس کا اختیار دیا ہو، تو جس حد تک جن شرائط کے ساتھ قانون نے اس کو اختیار دیا ہے، اسی حد تک انہی شرائط کے ساتھ اسے ایسے کرنے کا شرعاً بھی اختیار ہوگا۔

اس کی دو وجہ ہیں: ایک یہ کہ تعزیر کی کوئی خاص صورت، کوئی خاص طریقہ یا کوئی خاص مقدار شریعت نے ایسی مقرر نہیں کی، جس میں کمی بیشی کسی کو جائز نہ ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عدالت ملکی قانون کی تابع ہوتی ہے، تو شرعاً بھی اس کا ہر فیصلہ اس دائرہ کار تک موثر ہوگا، جو قانون نے اس کے لئے مقرر کیا ہے، پس جب قانون ہی نے کسی اور عدالت یا منصب دار کو پہلی عدالت کے دئے ہوئی سزا میں جزوی یا کلی معافی کا اختیار دے دیا، تو اس کے شرعی جواز میں کوئی مانع نہیں رہا۔

مگر ظاہر ہے کہ معافی کا یہ جواز کسی مجرم کے خصوصی حالات کا فرداً

فرداً مشاہدہ کرنے کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے، اور یہ جو طریقہ رائج ہے کہ کسی خاص تہوار یا موقع پر صدر یا گورنر وغیرہ ایک حکم عام کے ذریعہ ہر مجرم کے خصوصی حالات کا جائزہ لئے بغیر تعزیر میں کمی یا اسے ختم کرنے کا اعلان کر دیتے ہیں، تو یہ اعلان جواز کے اس دائرہ میں نہیں آتا۔

اور اگر تعزیر کا تعلق حق العبد سے ہے، تو اس سلسلہ میں جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس میں دی ہوئی سزا کی کلی یا جزوی معافی کا اختیار صرف اسی بندے کو ہے، جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، اور حاکم وغیرہ کو یہ سزا ساقط یا معاف کرنے کا اختیار نہیں، اس لئے تعزیرات سے متعلق ملکی قانون جمہور فقہاء کی فقہ کے مطابق ہونا چاہئے، تاہم اگر کوئی قانون پہلے سے بنا ہوا ہے، جس کی رو سے حق العبد میں بھی تعزیر کی معافی کا اختیار کسی عدالت یا کسی منصب دار کو دیا گیا ہے، تو اس کی بھی گنجائش ہے، کیونکہ اس مسئلہ میں شافیہ کا ایک قول رائج یہ بھی ہے کہ حق العبد سے متعلق بھی تعزیری سزا کو اکم معاف کر سکتا ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ اجتہادی مسئلہ سے متعلق فقہاء کرام کے مختلف اقوال میں سے کسی ایک قول کے مطابق جب حاکم کوئی فیصلہ کر دے، تو فقہی مسالک کا اختلاف رفع ہو جاتا ہے، یعنی وہ اختلاف مؤثر نہیں رہتا، اور حاکم کا فیصلہ ہی تمام فقہی مسالک کے لئے قابل نفاذ ہو جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہوں منسلک عبارت ۱۳ تا ۱۴)

حدود: حدود کا حکم یہ ہے کہ جب اجراء حد کا فیصلہ کوئی عدالت کر دے، تو اسے معاف کرنے کا کسی کو اختیار نہیں، معاف کرنے والا خواہ کوئی بڑے سے بڑا منصب دار (مثلاً وزیر اعظم یا صدر یا گورنر) ہی کیوں نہ ہو۔ کسی اور عدالت کو بھی ایسا کرنے کا شرعاً اختیار نہیں۔ (سوائے اس قانونی صورت کے جو عدالت اپیل کے بارے میں اوپر بیان ہوئی۔) (ملاحظہ ہوں منسلک عبارت ۱۵، ۱۶)

قصاص: قصاص کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ یہ شرعاً اولیاء مقتول کا حق ہے، وہ سب یا ان میں سے کوئی ایک اگر قصاص کو معاف کر دیگا، تو وہ معاف ہو جائے گا، اور اگر وہ کوئی مالی معاوضہ لیکر قصاص معاف کر دیں، تب بھی قصاص معاف ہو جائے گا، اور مالی معاوضہ واجب ہو جائے گا، اولیاء مقتول کے علاوہ کسی کو قصاص معاف کرنے یا قصاص کے عوض مال دیکر صلح کرنے کا اختیار نہیں، نہ وزیر اعظم، نہ صدر مملکت، اور نہ گورنر صاحبان کو، اور نہ کسی عدالت کو۔ (سوائے اس قانونی صورت کے جو عدالت اپیل کے بارے میں بالکل شروع میں بیان کی گئی۔) (ملاحظہ ہوں منسلک عبارت ۱۷، ۱۸، ۱۹)

اور اگر کوئی قانون ملک میں ایسا موجود ہو، جو کسی منصب دار کو اولیاء مقتول کی صریح اجازت کے بغیر قصاص معاف کرنے کا اختیار دیتا ہو، یا کسی حد کو معاف کرنے کا اختیار دیتا ہو، تو وہ قانون شریعت کے خلاف ہے، اور اسے تبدیل کرنا شرعاً واجب ہے۔

البتہ اگر قتل عمد کا مقتول بالکل لاوارث ہو، تو ایسی صورت میں اس کا ولی حکومت ہوگی، اور وہ قصاص کی بجائے قاتل سے دیت لیکر اسے چھوڑنے کی مجاز ہوگی، دیت کے بغیر چھوڑنا اس صورت میں بھی جائز نہ ہوگا، اور یہ وصول شدہ دیت بیت المال (ملکی خزانے) میں جائیگی، اور صرف ان ناداروں کا حق ہوگی، جو کمانے سے معذور ہیں۔ (ملاحظہ ہوں منسلک عبارت ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴)

۱..... فی الدر المختار: والتعزیر لیس فیہ تقدیر، بل ہو

مفوض الی رأی القاضی الخ (باب التعزیر)

۲..... وفی تکملة فتح الملهم: ان الشریعة الاسلامیة

قد قسمت العقوبات الجنائیة قسمین: الاول ما قدرت

الشریعة مقدارہ..... والثانی: ما لم يقدر الشریعة مقدارہ
وکيفيته، وانما قد فوضت تقديرها الى حاکم کل زمان
ومكان الخ. (۲/۲۶۲)

۳..... فی فتح القدير: ثم التعزير فيما شرع فيه التعزير
اذا راه الامام واجب وهو قول مالك واحمد، وعند الشافعي
ليس بواجب... وفي فتاوى قاضى خان: التعزير حق العبد
كسائر حقوقه يجوز فيه البراء والعفو... ولا يخفى على
احد انه ينقسم الى ما هو حق العبد وحق الله فحق العبد
يجرى فيه ما ذكر، واماما وجب منه حقاً لله تعالى فقد
ذكرنا آنفاً انه يجب على الامام ولا يحل له تركه الا فيما
علم انه انزجر الفاعل قبل ذلك (۵/۱۱۳)

۴..... البحر الرائق میں بھی وہی تفصیل ہے، جو فتح القدير سے ذکر
ہوئی، ملاحظہ ہو (۵/۷۵)

۵..... وفي الدر المختار: ويكون ايضا حقاً لله تعالى فلا
عفو فيه الا اذا علم الامام انزجار الفاعل (۶/۹۱)

۶..... معنی میں بھی وہی تفصیل ہے جو فتح القدير سے ذکر ہوئی
ملاحظہ ہو (۱۳/۵۲۷)

۷..... فی نهاية المحتاج: لكن لو طلبه لزم الامام اجابته
وامتنع عليه العفو عنه كما رجحه في الحاوى الصغير وتبعه
فروعه وغيرهم وان رجح ابن المقرئ خلافه، اما العفو فيما
يتعلق بحقه تعالى فيجوز له حيث يراه المصلحة (۸/۲۰)

۸..... وفي روضة الطالبين: وان تعلقت الجنایة بحق
آدمی فهل يجب التعزير؟ وجهان: احدهما: يجب وهو
مقتضى كلام صاحب المذهب كالقصاص. والثاني: لا
يجب كالتعزير لحق الله تعالى وهذا هو الذى اطلقه الشيخ
ابو حامد وغيره، ومقتضى كلام البغوى ترجيحه
(۱۷۶/۱۰)

۹..... وفي تبصرة الحکام لابن فرحون المالکي:
واختلفوا فی التعزير فقال مالك وابو حنيفة رحمهما الله
تعالى: ان كان لحق الله تعالى وجب كالحودود الا ان يغلب
على ظن الامام ان غير الضرب مصلحة من الملامة
والكلام، وقال الشافعي رحمه الله تعالى: هو غير واجب
على الامام ان شاء اقامه وان شاء تركه الخ (۲/۲۰۷)

۱۰..... وفي الشرح الكبير لابن قدامة: وان كان
التعزير لحق آدمی فطلبه لزم اجابته كسائر حقوق الآدميين
(۱۰/۳۶۳)

۱۱..... فی احکام القرآن للجصاص: ومما يدل على
نفاذ حکم الحاكم بما وصفنا من العقود وفسخها اتفاق
الجميع على ان ما اختلف فيه الفقهاء اذا حکم الحاكم
باحد وجوه الاختلاف نفذ حکمه وقطع ما امضاء تسويغ
الاجتهاد (۱/۲۵۴)

۱۲..... وفي الدر المختار من رسم المفتي: واما المقلد

فلا ينفذ قضاءه بخلاف مذهبه اصلاً، كما في الفية، قلت:
ولا سيما في زماننا فان السلطان ينص في منشوره على نهيه
عن القضاء بالاقوال الضعيفة فكيف بخلاف مذهبه فيكون
معزولاً بالنسبة لغير المعتمد من مذهبه فلا ينفذ قضائه فيه
رينقضى، كما بسط في قضاء الفتح والبحر والنهر وغيرها،
قال ابن البرهان: وهذا صريح الحق الذي يعرض عليه
بالبرهان (١٦٤/٩)

١٣..... وفيه: رلو قيده السلطان بصحيح مذهبه تقيد
بلا خلاف (٨٦/٨)

١٤..... ونفى التشريع الجنائي: من المسلم به في
الشريعة الإسلامية ان لو لى الامر حق العفو في جرائم
التعازير دون غيرهما من الجرائم، فله ان يعفو عن الجريمة
وله ان يعفو عن العقوبة كلها أو بعضها، وله حق العفو،
سواء في جرائم التعزير التي نصت عليها الشريعة او في
الجرائم التي نص عليها هو (٢٥٦/٢)

١٥..... في فتح الباري تحت قوله عليه الصلاة
والسلام: "اتشفع في حد من حدود الله؟"

ان النبي ﷺ قال لاسامة لما شفع فيها: "لا تشفع في حد
فان الحدود اذا انتهت الى فليس لها مترك" وله شاهد من
حديث عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده وقعه:

نعفو الحدود فيما بينكم فما بلغني من حد فقد وجب

١٦..... وفيه: وحديث عائشة مرفوعاً:

"اقبلوا ذوى الهيئات زلاتهم الا في الحدود" اخرج ابو
داؤد قال الله تعالى:

١٧..... وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيهِ سُلْطَانًا (سورة
الاسراء ٣٣) في تفسير القرطبي:

(سلطاناً) اى تسليطاً ان شاء قتل وان شاء عفا، وان شاء اخذ
الدية، قاله ابن عباس رضى الله تعالى عنهما والضحاك
واشهب والشافعي (٢٥٥/١٠)

١٨..... وفي روح المعاني:

(سلطاناً) اى تسليطاً واستيلاء على القاتل مؤاخذه بأحد
الامرين القصاص او الدية (٦٩/١٥)

١٩..... كذا في احكام القرآن للعلامة الجصاص
(٢٠٠/٣)

٢٠..... وفي بدائع الصنائع: ومنها السلطنة عند عدم
الورثة والملك والولاء كل ليقط اذا قتل، وهذا قولهما،
وقال ابو يوسف رحمه الله: ليس للسلطان ان يستوفي
القصاص اذا كان المقتول من اهل دار الاسلام، وله ان
ياخذ الدية، وجه قوله: ان المقتول في دار الاسلام لا يخلو
عن ولى عادة الا انه ربما لا يعرف وقيام ولاية الولي تمنع
ولاية السلطان وبهذا لا يملك العفو، بخلاف الحربى اذا
دخل دار الاسلام فاسلم ان الظاهر ان لاولى له في

دارالاسلام، ولهما ان الكلام في قتيل لم يعرف له ولي عند
الناس فكان وليه السلطان، لقوله عليه الصلاة والسلام:

”السلطان ولي من لا ولي له“

(٢٤٥/٧)

٢١..... وفي المغنى لابن قدامة: فصل: واذا قتل من
لا وارث له فالامر الى السلطان، فان احب القصاص فله.
ذلك، وان احب العفو على مال فله ذلك (٥٩٤/١١)

٢٢..... وفي الفقه الاسلامي وادلته للزحيلي: واذا لم
يكن للمقتول وارث غير جماعة المسلمين كان الامر
باتفاق الفقهاء الى السلطان (٢٨٠/٦)

٢٣..... في الدر المختار في بيان ”بيوت المال“:
ورابعها الضوائع مثل مالا يكون له اناس وارثونا
وفي رد المحتار: قوله ”الضوائع“ جمع ضائعة اي اللقطات،
وقوله: ”مثل مالا“ اي مثل تركة لا وارث لها اصلا اولها
وارث لا يرد عليه كاحد الزوجين، والاظهر جعله معطوفا
على ”الضوائع“ باسقاط العاطف، لان من هذا النوع ما نقله
الشرنبلالي دية مقتول لا ولي له (٢٨٢/٣)

٢٤..... وفي الدر المختار في بيان جهات بيوت المال:
ورابعها فمصرفه جهات

تساوى النفع فيها المسلمونا

وفي رد المحتار بعد بسط وتفصيل: وحاصله: ان مصرفها

العاجزون الفقراء (٢٨٢/٣)..... والله تعالى اعلم

محمد رفيع عثمانى عفا الله عنه

رئيس جامعه دارالعلوم كراچي

٨/١٢/٢٢ هـ

☆☆☆

مسائل چرم قربانی

(۳) فقراء و مساکین کو خیرات میں بھی دی جاسکتی ہے، مگر یہ مستحب ہے،

واجب نہیں۔ (بحر، عالمگیری)

(۴) قربانی کی کھال، گوشت، چربی، اون آنتیں وغیرہ، یعنی قربانی کے جانور

کا کوئی جزء کسی خدمت کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں، اگر دے دیا تو اس کی قیمت

کا صدقہ واجب ہے۔ (ہدایہ عالمگیری، امداد الفتاویٰ)

(۵) قربانی کے جانور کی جھول، رسی اور ہار جو گلے میں پڑا ہو، وہ بھی کسی کی

خدمت کے معاوضے میں دینا جائز نہیں، ان چیزوں کو خیرات کر دینا مستحب ہے۔

(شامی، عالمگیری ہدایہ و عزیز الفتاویٰ)

قربانی کی کوئی چیز قصائی وغیرہ کو بھی اس کی مزدوری میں دینا جائز نہیں،

اس کی مزدوری الگ دینی چاہئے۔ (ہدایہ، در مختار)

امام و مؤذن کو بھی حق الخدمت کے طور پر دینا جائز نہیں، اس کی مزدوری

الگ دینی چاہئے۔ (ہدایہ، در مختار)

امام مؤذن کو بھی حق الخدمت کے طور پر دینا جائز نہیں، حق الخدمت اور

معاوضے کے بغیر ہر ایک کو دے سکتے ہیں، ان کو بھی دے سکتے ہیں۔

کھال کی قیمت کے احکام

(۶) قربانی کی کھال یا اس سے بنائی ہوئی چیز کو فروخت کرنے میں یہ تفصیل

ہے کہ اگر وہ روپے کے بدلے فروخت کی تو اس رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے، اسی

طرح اگر ایسی کسی اور چیز کے بدلے میں فروخت کی جو باقی رہتے ہوئے استعمال

میں نہیں آتی، یعنی اسے خرچ کئے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، مثلاً

مسائل چرم قربانی

”منقول از البلاغ“ شمارہ ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ

”الحمد لله وكفى و سلام على عباده الذين اصطفى“

قربانی کی کھال فروخت نہ کی جائے تو شریعت نے قربانی کرنے والے کو

اس میں کئی طرح کا اختیار دیا ہے، لیکن فروخت کرنے سے اکثر صورتوں میں

قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہو جاتا ہے، بعض صورتوں میں واجب نہیں ہوتا۔

یہاں ان سب مسائل کی ضروری تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

کھال کے احکام

(۱) قربانی کی کھال اپنے اور اہل و عیال کے استعمال میں لانا جائز ہے، مثلاً

جائے نماز، کتابوں کی جلد، مشکیزہ، ڈول، دسترخوان، جراب، جوتہ وغیرہ کوئی بھی

چیز بنا کر استعمال کی جاسکتی ہے، بلا کر اہت جائز ہے۔ (ہدایہ و در مختار)

لیکن ان چیزوں کو کرایہ پر دینا جائز نہیں، اگر دے دیں تو جو کرایہ ملے، اس کا

صدقہ کرنا واجب ہے۔ (شامی عالمگیری)

(۲) یہ بھی جائز ہے کہ کھال یا اس سے بنائی ہوئی چیز کسی کو ہبہ میں (بلا

معاوضہ) دے دی جائے، خواہ وہ سید اور مالدار ہو، یا اپنے ماں باپ، اور اہل و عیال

ہوں، اجنبی ہو یا رشتہ دار، کافر ہو یا مسلمان، بلا معاوضہ ہر ایک کو دینا جائز ہے۔

(ہدایہ، عالمگیری، امداد الفتاویٰ)

ہے، جن لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، انہیں یہ صدقہ بھی نہیں دیا جاسکتا۔
تفصیل اگلے مسائل میں آرہی ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۳۶ و ص ۵۶۶ ج ۳)

(۸) جس کی ملکیت میں اتنا مال ہو کہ جس سے زکوٰۃ یا قربانی واجب ہو جاتی ہے، وہ شرعاً مالدار ہے، اسے یہ صدقہ دینا جائز نہیں، اور جس کے پاس اس سے کم مال ہو وہ شرعاً غریب اور مستحق زکوٰۃ ہے، اسے یہ صدقہ بھی دیا جاسکتا ہے۔

(در مختار ج ۲ ص ۲۰۰ و ج ۲ ص ۲۶۳ ج ۲)

نابالغ بچوں کا باپ اگر مالدار ہو تو ان کو بھی نہیں دے سکتے، لیکن اگر اولاد بالغ ہو اور مالدار نہ ہو تو ان کو دیا جاسکتا ہے، اسی طرح مالدار کی بیوی اگر مالدار نہ ہو تو اسے بھی دے سکتے ہیں۔ (ہدایہ)

اگر نابالغ بچوں کی ماں تو مالدار ہے، باپ مالدار نہیں، تو ان بچوں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ (در مختار)

(۹) سید اور بنو ہاشم کو (یعنی جو لوگ حضرت غلی، حضرت عباسؓ حضرت جعفرؓ، حضرت عقیلؓ یا حضرت حارث بن عبدالمطلب کی اولاد میں ہوں ان کو) یہ صدقہ دینا جائز نہیں۔ (شامی، ہدایہ، بحر، امداد الفتاویٰ)

(۱۰) اپنے مال باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، پردادا وغیرہ کو کہ جن کی اولاد میں یہ خود ہے، یہ صدقہ دینا درست نہیں۔ (ہدایہ ج ۱)

اسی طرح اولاد، پوتے پوتی، نواسے نواسی وغیرہ کہ جو اس کی اولاد میں داخل ہیں، ان کو دینے سے بھی یہ صدقہ ادا نہ ہوگا، شوہر اور بیوی بھی ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے۔ (ہدایہ ج ۱)

باقی سب رشتہ داروں کو دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں، بلکہ ان

کھانے پینے کی چیزیں، اور تیل، پٹرول، رنگ و روغن وغیرہ، تو ان اشیاء کا بھی صدقہ واجب ہے، یہ فقراء و مساکین کا حق ہے، کسی اور مصرف میں لانا جائز نہیں۔ (ہدایہ، بدائع، امداد الفتاویٰ)

ان اشیاء کے بدلے قربانی کی کھال اس نیت سے فروخت کرنا کہ اپنے خرچ میں لے آئیں گے، مکروہ بھی ہے، صدقہ کڑنے کی نیت سے فروخت کرنے میں مضائقہ نہیں، لیکن کسی بھی نیت سے فروخت کی ہو، بیع نافذ ہو جائے گی، اور ان اشیاء کا صدقہ بہر حال واجب ہوگا۔ (بحر، در مختار، عالمگیری)

اور اگر قربانی کی کھال، یا اس سے بنائی ہوئی چیز کسی ایسی چیز کے بدلے میں فروخت کی جو باقی رہتے ہوئے استعمال میں آتی ہے، یعنی اسے خرچ کئے بغیر اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے، مثلاً کپڑے، برتن، میز، کرسی، کتاب، قلم وغیرہ، تو ان اشیاء کا صدقہ واجب نہیں، بلکہ ان کا وہی حکم ہے جو پیچھے کھال کا بیان ہوا، کہ خود اپنے کام میں لانا، دوسرے کو ہبہ میں (بلا معاوضہ) دیدینا، اور خیرات کرنا، سب جائز ہے۔ (ہدایہ، بدائع، در مختار، امداد الفتاویٰ)

پھر اگر ان اشیاء کو روپے، یا کھانے پینے، اور خرچ ہونے والی اشیاء کے بدلے فروخت کر دیا تو حاصل ہونے والی قیمت کا صدقہ واجب ہوگا۔

(امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۵۷۳)

مصرف؟

(۷) اوپر، اور آگے جن جن مسائل میں صدقہ کا واجب ہونا بیان کیا گیا ہے وہ صدقہ صرف انہی فقراء و مساکین کو دیا جاسکتا ہے، جنہیں زکوٰۃ دینا درست

کو دینے میں دو گنا ثواب ہے، ایک خیرات کا، اور دوسرا اپنے عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک کا۔ (شامی ج ۲)

(۱۱) فتویٰ اس پر ہے کہ یہ صدقہ کافر کو نہ دیا جائے۔

(شامی ص ۹۲ ج ۲ دور مختار ص ۸۰ ج ۲ امداد المفتین ص ۳۶۳)

(۱۲) کسی کی مزدوری، یا حق الخدمت کے طور پر یہ صدقہ بھی نہیں دیا جاسکتا۔

(۱۳) زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کی طرح اس صدقہ کی ادائیگی کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ یہ کسی فقیر مسکین کو مالکانہ طور پر دے دیا جائے، جس میں اس کو ہر طرح کا اختیار ہو، اس کے مالکانہ قبضے کے بغیر یہ صدقہ بھی ادا نہ ہوگا۔

(در مختار ص ۱۸ ج ۳ امداد الفتاویٰ)

چنانچہ اسے مسجد، مدرسہ، شفا خانہ، کنویں، پل، یا کسی اور رفاہی ادارے کی تعمیر میں خرچ کرنا جائز نہیں، اسی طرح کسی لاوارث کے کفن و دفن، یا میت کی طرف سے قرض ادا کرنے میں بھی اسے خرچ نہیں جاسکتا، کیونکہ یہاں کسی فقیر کو مالک بنانا، اور اس کے قبضے میں دینا نہیں پایا گیا۔ (کنز، بحر، ہدایہ)

کسی ایسے مدرسے یا انجمن وغیرہ میں دینا بھی کہ جہاں وہ غریبوں کو مالکانہ طور پر نہ دیا جاتا ہو، بلکہ ملازمین کی تنخواہوں، یا تعمیر اور فرنیچر وغیرہ انتظامی مصارف میں خرچ کر دیا جاتا ہو، جائز نہیں، البتہ اگر کسی ادارے میں غریب طلبہ یا دوسرے مسکینوں کو کھانا وغیرہ مفت دیا جاتا ہو، تو وہاں یہ صدقہ دینا جائز ہے، لیکن یہ اس وقت ادا ہوگا جب وہ رقم بعینہ، یا اس سے خریدی ہوئی اشیاء مثلاً کھانا، کتابیں، کپڑے، دوا وغیرہ ان غریبوں کو مالکانہ طور پر مفت دے دی جائیں۔

حیلہ تملیک

البتہ اگر کھال کسی غریب یا مالدار کو، یا کھال کی رقم کسی غریب کو، مالکانہ طور پر قبضہ میں دیدی، اور صراحت کر دے کہ تم اس کے پوری طرح مالک ہو، ہمیں اس میں کوئی اختیار نہیں، پھر وہ اپنی خوشی سے اس رقم مسجد، مدرسہ یا کسی بھی رفاہی ادارے کی تعمیر یا اس کے ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ میں اپنی طرف سے لگا دے تو یہ جائز ہے، مگر یاد رہے کہ ”حیلہ تملیک“ کے نام سے جو کھیل عام طور سے کھیلا جاتا ہے اس سے زکوٰۃ کی طرح یہ صدقہ بھی اداء نہیں ہوتا، کیونکہ عموماً جس کو یہ دیا جاتا ہے وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ مجھے اس مال کا کوئی اختیار نہیں، اگر اپنے پاس رکھ لوں گا تو لوگ ملامت کریں گے، اس خوف اور شرم سے بے چارہ یہ رقم چندہ میں دیدیتا ہے، یہ محض زبانی جمع خرچ ہے، اس طرح نہ وہ مالک ہوتا ہے، نہ دینے والے کا صدقہ ادا ہوتا ہے، اس حیلے سے یہ رقم مسجد یا مدرسہ وغیرہ کی تعمیر و انتظامی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

(امداد الفتاویٰ ص ۵۳۴ ج ۳)

متفرق مسائل

(۱۴) بعض لوگ جانور کی کھال اس طرح اتارتے ہیں کہ اس میں چھری لگ کر سوراخ ہو جاتے ہیں، یا کھال پر گوشت لگا رہ جاتا ہے، جس سے کھال کو نقصان پہنچتا ہے، بعض لوگ کھال اتارنے کے بعد اس کی حفاظت نہیں کرتے، سڑ کر بے کار یا بہت کم قیمت کی رہ جاتی ہے، یہ سب امور اسراف اور ”تبذیر“

(فضول خرچی) میں داخل ہیں، جس کی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے، اس لئے کھال احتیاط سے اتار کر ضائع ہونے سے بچانا شرعاً ضروری ہے۔

(۱۵) جس نے قربانی کی کھال خریدی، وہ اس کا مالک ہو گیا، اور ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے، خواہ اپنے پاس رکھے، یا فروخت کر کے قیمت اپنے خرچ میں لائے۔ (امداد الفتاویٰ)

(۱۶) قربانی کی گائے میں جو لوگ شریک ہوں، وہ کھال میں اپنے اپنے حصے کے برابر شریک ہوں گے، کسی ایک شریک کو یہ کھال باقی شرکاء کی اجازت کے بغیر اپنے پاس رکھ لینا، یا کسی کو دے دینا جائز نہیں۔

(۱۷) اگر ایک شریک باقی شرکاء سے ان کے حصے جو کھال میں ہیں خرید لے تو اب پوری کھال اپنے استعمال میں لانے میں کوئی مضائقہ نہیں، پھر اگر یہ شخص اس کھال کو روپے، یا کھانے پینے کی اشیاء کے بدلے فروخت کرے گا، تو قیمت کا ساتواں حصہ جو اس کا اپنا تھا، اس کا صدقہ واجب ہوگا، اور باقی چھ حصے جو شرکاء نے خریدے تھے، ان کی قیمت کا صدقہ اس پر واجب نہیں اسے اپنے خرچ میں لاسکتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۵۷۷ ج ۳)

(۱۸) مذکورہ بالا سب مسائل میں جو احکام کھال کے ہیں، وہی جانور ذبح کرنے کے بعد اس کے اون اور بالوں کے ہیں اور اگر اون اور بال فروخت کر دیئے تو جو تفصیل کھال کی قیمت کے متعلق بیان کی گئی، وہی ان کی قیمت میں بھی ہوگی۔

مگر یاد ہے کہ قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے اس کی اون یا بال کاٹنا جائز نہیں، اگر کاٹ لئے تو ان کا یا ان کی قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے، اپنے استعمال

میں لانا جائز نہیں۔ (ہدایہ عالمگیری، بحر، شامی)

واللہ اعلم

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

خادم دارالعلوم کراچی

۲۲ ذیقعدہ ۱۴۰۰ھ

فلمی دھنوں میں نعت

فلمی دھنوں میں نعت

(منقول از "البلاغ" شمارہ صفر، ۱۳۸۸ء)

آج کل بعض عوامی شاعر فلمی دھنوں پر نعت لکھتے ہیں اور ایسے نعت مذہبی اجتماعات میں پورے طور سے فلمی سروں میں ادا کئے جاتے ہیں ایسی نعت کو شاعر مخرّب اخلاق فلمی ریکارڈ سننے ہوں گے جیسی تو وہ ان سروں پر نعت کہتے ہیں ایسے نعت خوانوں اور ایسے دوسرے شائقین کو مخرّب اخلاق فلمی ریکارڈ سننے کا چمکا پڑتا ہے شریعت اس کے بارے میں کیا حکم دیتی ہے؟

گلزار احمد کلچہ، ترمن، ضلع ڈیرہ غازی خان

اس کو شو مئی قسمت کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے کہ اول تو ہم ہر نیک کام سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں اور اگر کبھی اچھا کام کرنے کا جذبہ پیدا بھی ہوتا ہے تو اس میں جب تک کچھ ناجائز اور حرام کی آمیزش نہ کر لیں تسکین نہیں ہوتی سوال میں جو صورت بیان کی گئی ہے بلاشبہ یہ نعت جیسی روح پرور عبادت کو کھیل تماشا بنانا، اور اس کے ساتھ کھلانداق ہے۔

علامہ ابن عابدین نے رد المحتار میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جب کوئی شخص پانی کو شراب کے مشابہ بنا کر شراب کی طرح پئے تو اس کے لئے حرام ہے۔"

چنانچہ فقہاء نے کہا اگر کوئی شخص لہو و طرب کے ساتھ پانی یا کوئی اور حلال مشروب شرایبوں کی ہیئت بنا کر پئے تو یہ صورت حرام ہے، علامہ ابن عابدین نے بھی فقہاء کے اس قول سے اتفاق کیا ہے۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ من تشبہ بقوم فہو منهم (جو شخص کسی قوم یا گروہ کی نقالی کرے وہ انہی میں سے ہے) تو جب ناجائز کام کی نقالی کی اجازت مباح چیزوں میں بھی نہیں تو ایک عبادت کو حرام کے مشابہ بنا کر پیش کرنا تو ناجائز ہونے کے علاوہ عبادت کے ساتھ کھلانداق ہے اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی گستاخ نہایت خوش ذائقہ مٹھائی سڑے ہوئے کچڑ میں لیتھیر کر کسی حاکم کو بطور تحفہ پیش کرنے کی جسارت کرے۔

ایسے نعت گو حضرات کو اس فعل فتنج سے مناسب طریقہ سے روکنا چاہیے اور ان کی ہمت افزائی سے پورا اجتناب کرنا چاہیے۔

☆☆☆

داڑھی کی مقدار کی تحقیق

ڈاڑھی کی مقدار کی تحقیق

(منقول از البلاغ شمارہ ربیع الاول ۱۳۸۸ھ)

سوال: ڈاڑھی کس قدر رکھنی ضروری ہے، کیا نہ رکھنا گناہ ہے، کیا خط بنانا وغیرہ ضروری ہیں؟

مشتاق محمود خان

ہیڈ ڈرافٹسمین۔ قلات

جواب: ڈاڑھی کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اسے طول و عرض میں ایک مٹھی کی مقدار تک بڑھنے دیا جائے مٹھی بھر ہونے سے پہلے ڈاڑھی کو کاٹنا گناہ، اور اسلامی شعار کی خلاف ورزی ہے، البتہ مشیت بھر چھوڑ کر باقی کو کاٹنا سنت ہے۔

اس مسئلہ میں چونکہ بعض غلط فہمیاں اس زمانہ میں پیدا کر دی گئی ہیں، اس لئے کسی قدر توضیح ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس بات پر تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ ڈاڑھی بڑھانا واجب ہے، امت میں کسی فقیہ یا مجتہد نے ڈاڑھی ایک مشیت سے کم کرنے کو جائز قرار نہیں دیا، البتہ ایک مشیت سے بڑھے ہوئے بالوں کے بارے میں فقہائے اسلام کے تین قول ہیں، ایک یہ کہ بڑھے ہوئے بال کاٹنا بھی جائز نہیں، دوسرا یہ کہ بڑھے ہوئے بال کاٹنا واجب ہے، اور تیسرا یہ کہ کاٹنا سنت ہے، حنفیہ^(۱) اور شافعیہ وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ مذکورہ مسئلہ

میں احادیث کے دلائل درج ذیل ہیں۔

(۱) در مختار ص ۵۹ ج ۳۔

(۱) بخاری اور مسلم کی متفقہ روایت ہے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ ”خالفوا المشركين اعفوا اللحى واحفوا الشوارب“^(۱).

(مشکوٰۃ ص ۳۸۰ اصح المطابع کراچی)

”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مشرکین کی مخالفت کرو ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں خوب کاٹو۔“ مسلم کی روایت ہے۔

عن عائشةؓ قالت قال رسول اللہ ﷺ عشر من الفطرة قص الشارب واعفاء اللحية، الحديث.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ دس چیزیں فطرت میں سے ہیں، مونچھیں کاٹنا اور ڈاڑھی بڑھانا۔ الخ پہلی حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں (۱) ایک یہ کہ ڈاڑھی (صرف رکھنا ہی نہیں) بلکہ بڑھانا واجب ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس کا صریح حکم دیا ہے (۲) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ڈاڑھی بڑھانے کو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کا قومی شعار اور علامت قرار دیا ہے جو ان کی بیعت کو مشرکین کی بیعت سے ممتاز کرتا ہے۔

دوسری حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ڈاڑھی بڑھانا صرف اسی امت پر واجب نہیں کیا گیا بلکہ پچھلے تمام انبیاء اس پر عمل کرتے رہے ہیں اور ان کی

(۱) علامہ عینی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحاح ستہ میں سے بخاری کے علاوہ ہر کتاب میں موجود ہے، اور طحاوی نے اسے صحیح کہا ہے (یعنی شرح بخاری ۱۸۳ ج ۱۰)۔

امتوں کو بھی اس کا حکم دیا گیا تھا، کیونکہ اس حدیث میں داڑھی بڑھانے کو فطرت میں شمار کیا گیا ہے، اور وہ ہر شخص جو قرآن و سنت پر نظر رکھتا ہے جانتا ہے کہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں فطرت ان امور کو کہا جاتا ہے جن پر تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے متفقہ طور پر عمل کیا ہو اور ان کی امتوں میں وہ مشروع رہی ہوں۔ مذکورہ دونوں حدیثوں کا مضمون دیگر بہت سی احادیث میں بھی آیا ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، البتہ ان دونوں حدیثوں میں بڑھانے کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی، اگر دوسری احادیث جو آگے آرہی ہیں اس بارے میں موجود نہ ہوتیں تو مذکورہ دونوں حدیثوں کا تقاضا تھا کہ ایک مشیت سے بھی آگے بڑھانا واجب ہوتا، اور کسی حد پر داڑھی کو کاٹنا جائز نہ ہوتا، مگر ترمذی کی روایت ہے کہ۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم يأخذ من لحيته من عرضها وطولها. (مشکوٰۃ ص ۳۸۱، ص ۱ الطابع کراچی)

”کہ نبی ﷺ اپنی داڑھی کے طول و عرض میں سے کچھ لیا (کاٹا) کرتے تھے۔“

اس حدیث سے کاٹنے کی صحیح صحیح مقدار تو معلوم نہیں ہوئی (وہ اگلی روایت سے معلوم ہوگی) لیکن اتنا اس روایت سے بھی معلوم ہو گیا کہ یہ کاٹنا اتنا کم تھا کہ اسے ”کاٹنے“ سے تعبیر نہیں کیا گیا بلکہ ”یاخذ“ (لیا کرتے تھے) سے تعبیر کیا گیا ہے، پھر یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے داڑھی کو بڑھانا واجب کیا اور مسلمانوں کی قومی علامت قرار دیا ہے تو خود اپنی داڑھی آپ اتنی ہرگز نہ کاٹتے ہوں گے جو ”بڑھانے“ کے منافی ہو، چنانچہ دوسری روایت میں اس کی صراحت موجود ہے، اور تنویر شرح شریعت الاسلام میں اس

حدیث کے الفاظ ہی میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ :

كان يأخذ من لحيته طولاً وعرضاً إذا زاد على قدر القبضة وكان يفعل ذلك في الخميس أو الجمعة ولا يتركة مدة طويلة.

”آپ اپنی داڑھی کے طول و عرض میں سے لیا (کاٹا) کرتے تھے جبکہ بال مٹھی بھر سے زائد ہو جاتے تھے اور یہ آپ جمعرات یا جمعہ کو کیا کرتے تھے اور بالوں کو طویل مدت تک نہ چھوڑتے تھے۔“

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی (جو آپ کی سنتوں کے شیدائی مشہور ہیں) حج اور عمرہ کے وقت داڑھی کے ایک مٹھی سے زائد حصہ کو کترتے تھے۔

اور فتح الباری میں طبری کے حوالے سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ بھی جب داڑھی یکمشت سے زائد ہو جاتی تو کتر دیا کرتے تھے، ان سب روایات سے یکمشت سے زائد حصہ کو کترنے کا سنت ہونا معلوم ہوا۔

خلاصہ یہ کہ احادیث میں داڑھی بڑھانے کی تاکید آئی ہے، تمام فقہائے اسلام اس کے واجب ہونے پر متفق ہیں۔ پچھلے تمام انبیاء اور ان کی امتوں میں داڑھی بڑھانا مشروع تھا البتہ صرف ایک مشیت سے زائد حصہ کو کاٹنا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت ہے، اس سے زائد کا کاٹنا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں، لہذا داڑھی کو ایک مشیت ہونے سے پہلے کاٹنا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی نافرمانی اور اسلامی شعار کی خلاف ورزی ہے۔

اس مسئلہ کے اور بھی دلائل قرآن و سنت میں موجود ہیں یہاں خلاصہ ذکر کیا گیا ہے، واللہ اعلم۔

سفید بالوں کا خضاب

کرو۔

(۲) عن النبی ﷺ قال : يكون قوم في آخر الزمان

يخضبون هذا السواد كحواصل الحمام لا يجدون راحة

الجنة. (مشکوٰۃ ص ۸۳۲ ج ۲ بحوالہ ابوداؤد والنسائی)

وہ جنت کی ہوا بھی نہ پا سکیں گے۔

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہ کرام نے سیاہ خضاب بھی کیا ہے، تو دراصل وہ جہاد کی حالت میں تھا یا خالص سیاہ نہ تھا، بلکہ سرخ مائل بسیا ہی یا سبز مائل بسیا ہی تھا جو جائز ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کی صریح و شدید ممانعت کی خلاف ورزی صحابہ کرام کیسے کر سکتے تھے۔

☆☆☆

سفید بالوں کا خضاب

منقول از "البلاغ" شمارہ شوال ۱۳۸۸ھ

سوال: سفید بالوں کو خضاب کرنے کا کیا حکم ہے؟

کیا سرخ خضاب جائز اور سیاہ خضاب مکروہ یا حرام ہے؟

گلزار احمد۔ گلاچی، ترمن ضلع ڈیرہ غازی خان

جواب: سرخ خضاب بالاتفاق جائز بلکہ مستحب ہے، اور سیاہ خضاب جہاد میں دشمن کو مرعوب کرنے کیلئے بھی جائز ہے، باقی تمام حالات میں سیاہ خضاب کرنا مکروہ تحریمی ہے^(۱)۔ البتہ دوسرے رنگوں مثلاً سرخ، زرد یا سبز کا خضاب ہر حالت میں کیا جاسکتا ہے، فقہائے کرام نے یہ حکم مندرجہ ذیل احادیث سے حاصل کیا ہے۔

(۱) عن جابر "قال أتى بأبي قحافة يوم فتح مكة ورأسه

ولحيته كالثلغامه بياضاً فقال النبي ﷺ: غيروا هذا بشيء

واجتنبوا السواد. (مشکوٰۃ ص ۸۰ ج ۲ بحوالہ مسلم)

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ابو قحافہ (حضرت ابو بکرؓ کے والد) کو

فتح مکہ کے روز لایا گیا ان کا سر اور داڑھی بالکل سفید تھی تو نبی ﷺ

نے فرمایا کہ اس سفیدی کو کسی رنگ سے بدل دو مگر سیاہی سے پرہیز

(۱) امداد الفتاویٰ۔ ص ۲۰۳ تا ۲۱۰ ج ۳ طبع کراچی بحوالہ عالمگیری۔

لباس کے شرعی احکام

(۱) اگر بال منڈوائیں تو پورے سر کے منڈوائیں، کچھ حصہ کے منڈوانا اور کچھ کے نہ منڈوانا ممنوع ہے،

(۲) بالوں کی وضع میں کافروں اور فاسقوں کی نقالی اور مشابہت اختیار نہ کی جائے۔

(۳) مرد عورتوں کی وضع کے اور عورتیں مردوں کی وضع کے بال نہ رکھیں،

(۴) بال بڑے رکھنے ہوں تو ان کو صاف ستھرا رکھیں، تیل لگایا کریں، اور حسب ضرورت کنگھا بھی کیا کریں، بال بکھرے ہوئے نہ ہوں، مگر بالوں کو ایسا مشغلہ بھی نہ بنائیں کہ وہ تکلف اور قصص میں داخل ہو جائے۔

(۵) ننگے سر نہ پھریں۔

(۶) سفید بالوں پر سیاہ خضاب کرنا ممنوع ہے، کسی اور رنگ کا خضاب کر سکتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا عام معمول بال رکھنے کا تھا، کبھی کانوں کے نصف تک ہوتے تھے، کبھی کانوں کی لو تک، اور کبھی کاندھوں تک۔

(۲) لباس کے متعلق بھی اصول تو وہی ہے جو بالوں کے بارے میں بیان ہوا کہ کسی خاص تراش یا وضع کی پابندی شریعت نے نہیں لگائی، البتہ حدود اس کی بھی مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ ہونا چاہئے، وہ حدود یہ ہیں۔

(۱) مرد شلوار، تہ بند، اور پانچامہ وغیرہ اتنا نیچا نہ پہنیں کہ ٹخنے یا ٹخنوں کا کچھ حصہ اس میں چھپ جائے۔

(۲) لباس اتنا چھوٹا، باریک یا چست نہ ہو کہ وہ اعضاء ظاہر ہو جائیں جن کا چھپانا واجب ہے۔

(۳) لباس میں کافروں اور فاسقوں کی نقالی اور مشابہت اختیار نہ کریں۔

(۴) مرد زنانہ لباس اور عورتیں مردانہ لباس نہ پہنیں۔

لباس کے شرعی احکام

از البلاغ شمارہ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء و مفتیان شرع متین کہ:

(۱) مسلمانوں کے لئے شریعت نے سر کے بالوں کی کوئی خاص وضع یا تراش مقرر کی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس سلسلہ میں اگر کچھ حدود و قیود شریعت نے مقرر کی ہوں تو براہ کرم بیان فرمائی جائے۔

(۲) مسلمانوں کے لئے شریعت نے لباس کی کوئی خاص وضع یا ہیئت مقرر کی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو لباس کے سلسلہ میں جو حدود و قیود شریعت نے مقرر کی ہوں تو ازراہ عنایت بیان فرمائی جائے، والسلام

احقر محمد عمر

۲۳ فروری ۱۳۹۷ھ

جواب: (۱) سر کے بالوں کے لئے کسی خاص وضع یا تراش کی پابندی شریعت نے نہیں لگائی البتہ کچھ حدود ایسی ضرور مقرر کی ہیں کہ ان کے خلاف کرنا ممنوع ہے، ان حدود میں رہتے ہوئے آدمی جو وضع چاہے اختیار کر سکتا ہے، وہ حدود یہ ہیں۔

- (۵) اپنی مالی استطاعت سے زیادہ قیمت کے لباس کا اہتمام نہ کریں۔
 (۶) مالدار شخص اتنا گھٹیا لباس نہ پہنے کہ دیکھنے والے اسے مفلس سمجھیں۔
 (۷) فخر و نمائش اور تکلف سے اجتناب کریں۔
 (۸) لباس صاف ستھرا ہونا چاہئے، مردوں کے لئے سفید لباس زیادہ پسند کیا گیا ہے۔

- (۹) مردوں کی اصلی ریشم کا لباس پہننا حرام ہے۔
 (۱۰) خالص سرخ لباس پہننا مردوں کے لئے مکروہ ہے، کسی اور رنگ کی آمیزش ہو، یاد دہاری دار ہو تو مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم

کتبہ محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ

نائب مفتی دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

۱۵/۲/۱۳۹۵ھ

الکحل اور اسپرٹ کے شرعی احکام

الجواب وهو الموفق للصواب

(۱) حکم شرعی کے لحاظ سے الکحل کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) قسم اول وہ الکحل جو منفی، انگور، کھجور کی شراب سے بنایا گیا ہو، یہ بالاتفاق ناپاک ہے جس دوا میں یہ ملایا گیا ہو وہ بھی ناپاک ہے اور اس کا پینا حرام ہے البتہ شدید اضطرابی حالت میں ایسی دوا پینے کی رخصت ہے اور شدید اضطرابی حالت یہ کہ ماہر معالج کا ظن غالب یہ ہو کہ اس مریض کو اس دوا سے شفا ہوگی۔ کسی اور دوا سے شفا نہ ہوگی تو ایسی صورت میں اس قسم کا الکحل ملی ہوئی دوا پینے کی بقدر ضرورت گنجائش ہے۔

ففي النهاية عن الذخيرة الاستشفاء بالحرام يجوز إذا علم

أن فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر. (البحر الرائق ج ۱ ص ۱۲۲)

(۲) قسم دوم وہ الکحل ہے جو مذکورہ اشیاء کے علاوہ اور چیز مثلاً جو، آلو، شہد وغیرہ کی شراب سے بنایا گیا ہو، اس کی طہارت و حرمت میں فقہاء کا اختلاف ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ اور ابو یوسف کے نزدیک یہ پاک ہے اور اتنی مقدار میں پینا بھی کہ جس سے نشہ نہ ہو حلال ہے (بشرطیکہ پینا بقصد لہو و طرب نہ ہو) اور امام محمد کے نزدیک یہ نجاست خفیفہ ہے، اور اس کی تھوڑی مقدار پینا بھی جائز نہیں، فتویٰ اگرچہ عام حالات میں امام محمد کے قول پر دیا گیا ہے مگر چونکہ الکحل میں ابتلائے عام ہے لہذا جس دوا میں قسم دوم کا الکحل ہو اس کے بارے میں گنجائش ہے کہ امام اعظم و امام ابو یوسف کے قول پر عمل کر لیا جائے اگرچہ تقویٰ اور

الکحل اور اسپرٹ کے شرعی احکام

منقول از "البلاغ" شمارہ صفر المظفر ۱۳۹۳ھ

سوال: آنجناب کے علم میں ہے کہ ایلو پیتھک اور ہو میو پیتھک کی بے شمار دواؤں میں الکحل ڈالا جاتا ہے اور اسپرٹ بھی، ان دونوں طریقہ علاج میں بکثرت استعمال ہوتی ہے انجکشن وغیرہ میں اس کا استعمال خصوصاً ایک ڈاکٹر کو ہر وقت ہی کرنا پڑتا ہے، مگر سنا ہے کہ اسپرٹ اور الکحل ناپاک اور حرام ہے جس کے باعث سخت تشویش ہے، کیونکہ آج کل اسپرٹ اور الکحل سے مکمل پرہیز کرنا بڑا مشکل ہے۔ براہ کرم مندرجہ ذیل سوالات کا ثانی جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

(۱) کیا الکحل ہر قسم کی ناپاک ہے یا کوئی قسم پاک بھی ہے؟ اگر کوئی قسم پاک بھی ہے تو ازراہ کرم اسے متعین فرمایا جائے جو قسم ناپاک اور حرام ہے سخت ضرورت کی صورت میں اس کی استعمال کی بھی کسی حد تک گنجائش ہے یا نہیں؟

(۲) اگر کسی الکحل کے بارے میں یہ نہ معلوم ہو سکے کہ کونسی قسم کا ہے تو اس وقت شرعی کیا حکم ہے؟

(۳) شرعاً اسپرٹ کا حکم بھی الکحل کی طرح ہے یا کچھ فرق ہے، اگر کچھ فرق ہے تو ازراہ کرم اس کو بھی واضح فرمادیا جائے۔

احتیاط امام محمدؒ کے قول پر عمل کرنے میں ہے۔

(۳) قسم سوم وہ الکحل ہے جو کسی بھی شراب سے نہ بنایا گیا ہو بلکہ کسی پاک و حلال چیز مثلاً منقہ، کھجور، انگور، آلو، جو، شہد وغیرہ سے بنایا گیا ہو وہ بھی پاک اور حلال ہے۔

(۲) اگر الکحل کی قسم معلوم نہ ہو تو چونکہ اس کے ناپاک ہونے کا ظن غالب نہیں بلکہ محض ایک شبہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ قسم اول سے ہو تو محض شبہ کی بناء پر اس کی نجاست یا حرمت کا حکم نہیں لگایا جائے گا لہذا جس دواء میں بھی ایسا الکحل ملا ہو جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ (مذکورہ تینوں قسموں میں سے کس قسم کا ہے) تو ایسی دوا کے کھانے اور پینے کی گنجائش ہے اور جس کپڑے کو یہ دواء لگ جائے اسے ناپاک نہ کہا جائے دھوئے بغیر نماز پڑھے تو اس کی نماز ادا ہو جائے گی البتہ جو شخص ایسے الکحل سے بھی اجتناب کرنے پر قادر ہو تو جس حد تک اجتناب کرے بہتر ہے۔

خلاصہ یہ کہ الکحل کی قسم یا تو معلوم ہوگی یا نا معلوم اگر معلوم ہو تو وہ قسم استعمال کی جائے جو قسم پاک اور حلال ہو خصوصاً جبکہ قسم اول مہنگی اور قسم دوم سوم ارزاں ہوتی ہے، اور اگر قسم معلوم نہیں تو علاج میں استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور جس کپڑے یا بدن کو لگ جائے اسے ناپاک نہ کہیں گے، دھوئے بغیر کوئی نماز پڑھ لے تو نماز ادا ہو جائے گی بہشتی زیور حصہ نہم (اصلی طبیب جوہر) میں اسپرٹ کے مسائل تفصیل سے لکھے ہیں اسکی مراجعت بھی آپ کے لئے مفید ہوگی۔

(۳) شرعاً الکحل اور اسپرٹ کے حکم میں کوئی فرق نہیں، الکحل کی ادھر جو

تین قسمیں بیان ہوئیں وہی تین قسمیں اسپرٹ کی بھی ہیں اور ہر قسم کا جو حکم بیان کیا گیا وہی حکم اسپرٹ کا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح کتبہ محمد رفیع عفا اللہ عنہ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ نائب مفتی دارالعلوم کراچی نمبر ۱۳

۱۳۹۳/۱/۲ھ

ایک مشہور فرضی وصیت نامہ کی
اصل حقیقت

ایک وصیت نامہ کی تحقیق

منقول از "البلاغ" شمارہ صفر ۱۳۸۸ھ

حال میں ایک وصیت نامہ شائع ہوا ہے جس کا نسبت حضور اقدس ﷺ کی طرف کی گئی ہے اس میں لکھا ہے کہ شیخ احمد خادم روضہ نبویہ (علی صاحبہ الصلوٰۃ والتحیہ) کو خواب میں بشارت ہوئی ہے کہ میری امت کو یہ یہ باتیں پہنچا دو، اس میں یہ بھی ہے کہ جو اس کو شائع کرے گا وہ بہت نفع پائے گا، اور جو اس کو جھوٹا جانے گا اس کا نقصان ہو گا۔ اس وصیت نامہ کے بارے میں ارشاد فرمائیں۔

(ایک مسلمان)

یہ وصیت نامہ نیا نہیں ہے بلکہ تقریباً سو سال سے شائع ہوتا ہے۔ ۲۵-۳۰ سال قبل بھی علمائے وقت سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، اس وقت علماء نے تحقیق کی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ شیخ احمد نامی خادم روضہ مبارکہ کا کوئی صاحب نہیں ہیں، نہ کبھی کوئی صاحب تھے بلکہ خدمت روضہ اقدس کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آتا جس حجرہ شریفہ میں قبر اطہر ہے وہاں تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہوتی ہے اس کے چاروں طرف تین چار دیواریں محیط ہیں، جیسے جیسے سنت نبویہ سے بعد ہوتا گیا، قبر اطہر حجابات میں محجوب ہوتی چلی گئی اور تنکوینی طور پر ایسا ہوتا چلا گیا، اس لئے جاروب کشی اور خدمت کا موقع ہی نہیں رہا۔ تفصیل کے لئے فضائل حج مؤلفہ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم مظاہر علوم سہارنپور مطالعہ فرمائیں۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ وصیت نامہ خود ساختہ ہے چونکہ اس میں یہ بھی چھپا ہوا ہوتا ہے کہ جو شائع کرے گا اس کو نفع ہو گا اس لئے ناواقف مسلمان شائع کرتے رہتے ہیں۔

۲۵، ۳۰ سال قبل جب علماء نے تحقیق کی تھی تو پتہ چلا تھا کہ وصیت نامہ کے موجد اور فرضی افسانہ گڑھنے والے نصرانی ہیں جسکو ان کی مشنریوں نے آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر کے شائع کیا تھا۔

فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ نصرانی کو شائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس وصیت نامہ میں دین پر چلنے کے لئے لکھا ہے، مسلمانوں کو دین اسلام پر چلانے میں ان کو کیا نفع ہے؟ بات یہ ہے کہ جس وقت انگریزوں نے ہندوستان میں قدم جمائے اس وقت طرح طرح سے ایسی تدبیریں کرتے رہے ہیں کہ ہندوستان کبھی چھوڑنا نہ پڑے، پہلے تو انہوں نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی، مناظرے کرائے اس مقصد کے لئے باہر سے عیسائی بلائے گئے، جب علماء حق نے مذہب نصرانیت کے تار پود بکھیر کر رکھ دیے اور اس کا باطل ہونا ظاہر ہو گیا اور دلائل کے سامنے عیسائی پادری شکست کھا گئے تو حکومت نے اور اس کی مشنریوں نے دوسرے راستے اپنے جماؤ کے اختیار کئے، عیسائی پادریوں کو شکست دینے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کی کوششیں تاریخ میں زندہ یادگار ہیں، ان حضرات کے بعد مولانا عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اس پر توجہ کی اور مقدمہ تفسیر میں نصرانیت کے خلاف بہت کچھ لکھا اور جگہ جگہ تفسیر میں خوب رد کیا۔ جزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

مناظروں میں شکست کھانے کے بعد یہ کوشش کی کہ عالم ایسے پیدا ہوں جو حکومت کے ترجمان ہوں اور پختہ عالم نہ ہوں اس مقصد کے لئے جگہ جگہ مدارس قائم کئے، کلکتہ، مدراس، پٹنہ وغیرہ میں ایسے مدارس اب تک موجود ہیں، انگریزوں کو چونکہ مسلمانوں ہی سے خطرہ تھا کیونکہ مسلمانوں ہی سے ملک لیا تھا اور مسلمانوں میں جذبہ جہاد موجود تھا، اس لئے یہ کوشش شروع کی کہ ان کے اندر سے جذبہ جہاد ختم کیا جائے، کلکتہ مدرسہ کے نصاب سے اب تک کتاب الجہاد ہر کتاب سے خارج ہے، دشمنوں نے سوچا کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا تو مشکل ہے لہذا کم از کم یہی ہو جانا چاہیے کہ جو جماعتیں ہندوستان کو انگریزوں سے واپس لینا چاہتی ہیں ان کی ہمنوائی نہ کریں اور جہاد سے غافل ہو کر نماز روزہ میں لگے رہیں، اس مقصد کے لئے عیسائی مشنریوں نے یہ فرضی وصیت نامہ تیار کر کے شائع کیا، شروع میں جب یہ وصیت نامہ شائع ہوا تھا اس وقت اس میں سنہ مقرر کر کے لکھا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے شیخ احمد سے فرمایا ہے کہ فلاں سنہ میں یہ علامت قیامت ظاہر ہوگی اور فلاں سنہ میں یہ ہوگا اور فلاں سنہ میں سینوں سے قرآن نکل جائے گا پھر جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا اور ان کی خود تراشیدہ تواریخ غلط ہوتیں چلی گئیں تو تاریخیں اور مخصوص سنین کے حوالہ جات بدلتے رہے اور اب جو وصیت نامہ شائع ہوتا ہے اس میں یہ باتیں تقریباً بالکل نہیں ہیں اور یہ بات تو سراسر حدیث کے خلاف ہے کہ قرآن سینوں سے اٹھ جائے گا حدیث شریف میں ہے کہ:

ان الله لا يقبض العلم إنتزاعاً ينتزعه من العباد ولكن يقبض

العلم بقبض العلماء (مشکوٰۃ شریف ص ۲۳)

”یعنی اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہ اٹھائے گا کہ زندہ انسانوں کے سینوں

سے اٹھالے بلکہ علم اس طرح ختم ہوگا کہ علماء اٹھ جائیں گے اور لوگ آگے ان کا علم بڑھانے والے پیدا نہ ہوں گے۔“

خلاصہ یہ ہے کہ یہ وصیت نامہ فرضی ہے، شیخ احمد نامی کوئی صاحب روضہ اقدس کا خادم نہیں ہے اس میں جو عبادت کی طرف متوجہ ہونے اور آخرت کی طرف فکر میں لگنے کو لکھا ہے یہ اچھی باتیں ہیں اور ضروری ہیں، مگر اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے قرآن و حدیث کے خطابات کافی ہیں، فرضی افسانہ شائع کرنا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف کسی تراشیدہ بات کو منسوب کرنا سخت گناہ ہے، حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میری جانب سے کوئی بات جھوٹ کہدے اس کو چاہیے کہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنا لے۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۳۲)

☆☆☆

خواتین کو لکھنے کی تعلیم

شرح

عقود رسم المفتی

تالیف

العلامه محمد امين ابن عابدين رحمه الله

مع تعليقات نافعه

الفضيله الشيخ المفتى محمد رفيع العثمانى حفظه الله

رئیس جامعه دارالعلوم کراتشی

کتاب کا مختصر تعارف

بارہویں صدی ہجری کے معروف اور مدبر آوردہ فقیہ امام ابن عابدین شامیؒ کی یہ کتاب جو اصول افتاء کے موضوع پر ہے اہل علم اور مفتیان کے حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، اس پر حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے مفید حواشی اور تعلیقات نافعہ جو درحقیقت اس موضوع پر لکھی گئیں مختلف کتب کے مطالعہ اور ان کے تجر علمی اور فقہیت کا نچوڑ ہیں۔ اس کتاب کو چار چاند لگا دیئے اور اس کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے، اب یہ کتاب نئے انداز سے زیور طبع سے آراستہ پیراستہ ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔

مکتبہ جامعہ دارالعلوم کراچی - ۱۴ پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰

فون نمبر - ۶-۴۷۷۷۵۰.....۵۰۴۲۲۸۰